بلاشبہ توحید کا عقیدہ ہے ۔ چنانچہ اس نے یہ جو کہا کہ میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا تو یہ "سیدھی راہ" وہی توحید کی راہ ہے جس کو قرآن نے 'صراط مستقیم' سے تعبیر کیا ہے ۔ اور یہ جو اس نے کہا کہ تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار نہ پائے گا، تو یہ بھی اس بات کی تعبیر ہے کہ میں ان کو شرک میں مبتلا کر دوں گا اور یہ تیری حمد کے بجائے دوسروں کی حمد کے ترانے گائیں گے۔

[illegible]

'وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ' (میں ان کو جھوٹی آرزوؤں میں پھنساؤں گا) میں اس طرح کی جھوٹی آرزوؤں کی طرف اشارہ ہے جن میں بالعموم مشرک قومیں مبتلا ہو جاتی ہیں ۔ مثلاً عربوں کا یہ عقیدہ کہ وہ جن دیویوں اور دیوتاؤں کو پوجتے ہیں وہ خدا سے ان کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ انھی کی سفارش سے ان کو دنیا کی نعمتیں بھی ملتی ہیں اور اگر آخرت کوئی چیز ہے تو انھی کی سفارش سے آخرت میں بھی وہ جنت کے حقدار ٹھہریں گے ۔ اسی طرح یہود اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ ابراہیم خلیل اللہ اور خدا کے برگزیدہ بندوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے وہ خدا کے بیٹوں اور محبوبوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جنت کے پشتینی حق دار ہیں، ان کے اعمال کچھ ہوں دوزخ کی آگ اول تو ان کو چھوئے گی ہی نہیں اور اگر چھوئے گی تو محض عارضی طور پر۔ ان کی ان باطل آرزوؤں پر ہم بقرہ کی آیت ۸۰ اور ۱۱۱ کے تحت بحث کر چکے ہیں۔ علی ہذا القیاس نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ خدا نے اپنے بیٹے کو ان کے تمام گناہوں کا کفارہ بنا دیا ہے، اب وہ عمل و اطاعت کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔

مشرکانہ نذریں

'فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ' ، بتک کے معنی کاٹنے، چیرنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ مشرک قوموں میں یہ مشرکانہ روایت رہی ہے کہ وہ خاص خاص جانوروں کو ان کے کان چیر کر اپنے فرضی معبودوں کے نام پر بطور نذر چھوڑ دیتی رہی ہیں۔ یہ کان چیرنا اس مقصد کے لیے ہوتا تھا کہ دوسرے ان کو نذر سمجھ کر ان سے تعرض نہ کریں۔

'تغییر خلق اللہ' کا مفہوم

'فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ' (پس وہ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلیں گے) اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلنے سے اصلاً مراد اس فطرت اللہ کو بدلنا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام خلائق کو پیدا کیا ہے۔ مثلاً توحید دین فطرت ہے لیکن شیطان اور اس کے ایجنٹوں نے اس کو شرک سے مسخ کیا۔ سورۂ روم میں شرک کی تردید کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳۰-۳۱ روم)	پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ دین حنیفی کی طرف کرو۔ یہی اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلنا جائز نہیں۔ یہی سیدھا فطری دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور اسی سے ڈرتے ہوئے نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ بنو۔

اس آیت میں توحید کو "دینِ فطرت" اور "دینِ قیم" سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اسی پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت اور ساخت کو بدلنا جائز نہیں۔ ہمارے نزدیک زیرِ بحث ٹکڑے میں بھی یہی مراد ہے۔ ضمناً اس کے تحت وہ ساری چیزیں آ جائیں گی جو فطرت اللہ کی تبدیلی کے حکم میں ہیں۔ مثلاً عورتوں کا مرد بننا یا مردوں کا عورت بننا یا عورتوں اور مردوں کو ناقابلِ اولاد بنانا اور اس قبیل کی دوسری خرافات۔

لفظ امر کے مختلف مفہوم

'وَلَاٰمُرَنَّهُمْ' میں شیطان کے جس امر کا ذکر ہے اس کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عربی میں امر کا لفظ حکم دینے، مشورہ دینے اور سمجھانے، سب معنوں میں آتا ہے۔ شیطان ان تمام طریقوں سے توحید کی راہ مارتا ہے۔ وہ اپنے القائے شیطانی سے دلوں میں وسوسے بھی ڈالتا ہے اور جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ اس کے ایجنٹ بن جاتے ہیں ان کے واسطے سے مشورے بھی دیتا ہے اور اگر اس کے ایجنٹ زور آور اور با اقتدار ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھوں قانون بھی بنواتا ہے اور اس قانون کو نافذ بھی کرواتا ہے۔

اجزا کی تشریح کے بعد اب ان آیات کے نظام اور ان کے مفہوم پر بحیثیت مجموعی بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

شرک کا بودا پن اور اس کا حسب و نسب

اوپر کی آیت میں شرک کے ناقابلِ مغفرت جرم ہونے کا ذکر ہوا تو لگے ہاتھوں شرک کے بودے پن اور اس کے حسب و نسب کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ اس کا مکروہ چہرہ اچھی طرح بے نقاب ہو جائے۔

بودے پن کا ذکر دو پہلوؤں سے فرمایا۔ ایک تو یہ کہ شرک کا یہ سارا کارخانہ دیویوں کے بل بوتے پر قائم ہے، اول تو یہی پرلے سرے کی حماقت ہے کہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کا سہارا انسان ڈھونڈے، پھر حماقت در حماقت یہ کہ سہارا بھی فرضی عورتوں کا جن کی بے بسی اور ناتوانی خود ضرب المثل ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کی تمام تر بنیاد شیطان کی پیدا کی ہوئی جھوٹی آرزوؤں اور اس کے پرفریب وعدوں پر ہے اور شیطان کے سارے وعدے بالکل بے حقیقت ہیں۔ جب حقیقت کھلے گی تو نظر آئے گا کہ نہ ابراہیمؑ کا حسب و نسب کچھ نافع ہے اور نہ لات و منات اور ان کی شفاعت کا کوئی وجود ہے بلکہ سارا معاملہ ایمان و عمل صالح پر منحصر ہے۔ جن کے پاس یہ متاع نہیں ہے ان کے لیے صرف جہنم ہے جس سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے۔

اس کے حسب و نسب کا بیان اس طرح فرمایا کہ اس کا موجد اور امام ابلیس لعین ہے جس نے جوشِ حسد میں پہلے ہی روز یہ دھمکی دے دی تھی کہ میں تیرے بندوں میں سے اپنا حصہ بٹا کر رہوں گا، میں ان کو گمراہ کروں گا، ان کو طرح طرح کی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا کروں گا اور میرے حکم سے بتوں کو نذرانے پیش کریں گے اور میرے القا سے فطرت اللہ کو مسخ کریں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس شیطان لعین و متمرد کو اپنا مرجع اور کارساز بنائیں ان سے زیادہ بدبخت اور نامراد کون ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ شیطان ان کو وعدوں کے سبز باغ دکھا رہا ہے اور آرزوؤں کے جال ان کے آگے بچھا رہا ہے حالانکہ شیطان کے سارے وعدے محض فریب ہیں۔ نہ شفاعت ان کے کام آنی ہے نہ بزرگوں سے نسبت۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے کوئی مفر نہ ہوگا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ۝ لَّيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَن يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۝ (۱۲۲-۱۲۴)

نجات کی راہ ایمان و عمل صالح ہے نہ کہ جھوٹی آرزوئیں

یعنی شیطان کے وعدے اور اس کی پیدا کی ہوئی آرزوئیں تو محض جھوٹ اور فریب ہیں۔ البتہ اللہ کا وعدہ یہ ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کریں گے ان کو وہ جنت میں داخل کرے گا اور یہ وعدہ بالکل حق ہے اس لیے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کے وعدے سے زیادہ سچا وعدہ کس کا ہو سکتا ہے۔ پھر فرمایا کہ نجات سے متعلق یہ جھوٹی آرزوئیں خواہ تمہاری ہوں (اشارہ منافقین کی طرف ہے) یا اہل کتاب کی ان میں سے کوئی بھی پوری ہونے والی نہیں ہے۔ جو بھی برائی کرے گا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا اور خدا کے سوا کوئی اس کا کارساز و مددگار نہ بن سکے گا۔ اسی طرح جو عمل صالح کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ مومن ہے تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ذرا بھی ان کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

منافقین اور اہل کتاب دونوں کی آرزوؤں کا ایک ساتھ ذکر کر کے قرآن نے یہ واضح کر دیا کہ شرک، شفاعت اور خاندانی برگزیدگی کے بل پر جنت کے خواب دیکھنے والے سب ایک ہی جنت الحمقاء کے بسنے والے اور ایک ہی دامِ فریب کے گرفتار ہیں اور ان سب کی نامرادی ایک ہی طرح کی ہے۔ آخرت کی بازی ان لوگوں کی ہے جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جس کے پاس یہ دولت ہوگی، وہ فائز المرام ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اسرائیلی ہے یا اسمٰعیلی، عربی ہے یا عجمی۔ اس طرح کی کسی نسبت کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی کمی نہیں ہوگی۔

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ۝ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطًا ۝ (۱۲۵-۱۲۶)

ملت ابراہیم

اب یہ اس ھُدَی اللّٰہ اور سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْن کی سند اور اس کا درجہ و مرتبہ واضح فرمایا جس کی مخالفت کو شرک قرار دیا ہے اور جس سے یہ اوپر والی بحث پیدا ہوئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی مخالفت اور اس سے انحراف کے کیا معنی؟ آخر اس کے دین سے بڑھ کر کس کا دین ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو یک قلم اللہ کے سپرد کر دے اور ساتھ ساتھ وہ محسن بھی ہو یعنی اپنے رب کے ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرے جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے۔ یہی ملت ابراہیمؑ ہے۔ جس نے یہ راہ اختیار کی اس نے ملت ابراہیمؑ کی پیروی کی اور ابراہیمؑ کی ذات تو وہ ہے جن کو خدا نے اپنا دوست بنایا تو ان کی ملت سے بڑھ کر کس کی ملت ہو سکتی ہے۔ آخر میں اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ کی علت واضح فرما دی کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ واحد ہی کا ہے اور وہ ہر چیز کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے تو اس کے سوا

حق دار بھی کون ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا جائے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے خلیل اللہ ہونے کا ذکر تورات میں بھی بار بار ہوا ہے اور یہ چیز منجملہ ان چیزوں کے ہے جن کے سبب سے بنی اسرائیل اس آرزوئے باطل میں مبتلا ہوئے کہ چونکہ وہ اللہ کے دوست کے خاندان سے ہیں اس وجہ سے ان کی حیثیت اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ اور اَحِبَّآؤُہٗ کی ہے اور جب ان کی حیثیت یہ ہے تو دوزخ کی آگ کی کیا مجال ہے کہ وہ ان کو چھوئے۔ اس وہم کی تردید کے لیے یہاں یہ بھی واضح فرمایا کہ ابراہیمؑ کو اللہ نے اپنا جو دوست بنایا تو اس وجہ سے بنایا کہ انھوں نے ہر طرف سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دیا۔ ان کی ملت اسلام اور توحید کی ملت ہے اور وہ اس ملت توحید کے امام ہیں۔ اس وجہ سے دینِ حق ان کا دین ہے جو اس امامِ توحید کی ملت کے پیرو ہیں نہ کہ ان کا جو امامِ شرک ابلیس کے پیرو ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے خلیل اللہ ہونے کی وجہ

۳۶۔ آگے کا مضمون —— آیات ۱۲۷-۱۳۴

اسلامی معاشرہ کی تاسیس، تنظیم اور تطہیر سے متعلق جو باتیں اصولی تھیں وہ اوپر کی آیات پر تمام ہوئیں۔ اب آگے کا حصہ، سورہ کے آخر تک، خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پہلے بعض سوالات کے جواب دیے ہیں جو اسی سورہ کی آیات ۲-۴ میں بیان کردہ احکام سے متعلق بعد میں پیدا ہوئے، اس کے بعد آخر سورہ تک مسلمانوں کو، منافقین کو اور اہل کتاب کو خطاب کر کے آخری تنبیہ کی نوعیت کی نصیحتیں فرمائی ہیں۔ یہ سوالات بعد میں پیدا ہوئے اس وجہ سے ان کے جواب سورہ کے آخری باب کے ساتھ رکھے گئے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ یہ بعد میں نازل ہوئے ہیں۔ اس سے احکام کی حکمت سمجھنے میں رہنمائی ملتی ہے۔

زیر بحث مجموعہ آیات کو سمجھنے کے لیے آیات ۲-۴ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ وہاں یتامیٰ کی مصلحت اور بہبود کے پہلو سے ان کی ماؤں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو اس کے ساتھ چار کی قید اور ادائے مہر اور عدل کی شرط لگی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، مہر اور عدل دونوں ہی چیزوں سے متعلق لوگوں کے اندر سوالات پیدا ہوئے۔ مہر سے متعلق یہ کہ جن عورتوں سے نکاح انھی کے یتیم بچوں کی مصلحت سے کیا جائے، انھیں مہر ادا کرنے کی پابندی ایک بھاری شقت ہے جس کو اولیا برداشت نہیں کر سکیں گے اسی طرح اگر عدل کا مفہوم قلبی میلان اور ظاہری سلوک دونوں میں کامل مساوات ہے تو یہ بھی ناممکن ہے۔ ایک شخص نے اپنی ایک پسندیدہ بیوی رکھتے ہوئے اگر ایک عورت سے صرف اس خیال سے نکاح کیا ہے کہ اس کے یتیم بچوں کی تربیت اور ان کے حقوق کی نگہداشت میں سہولت ہو جائے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی چہیتی بیوی اور اس دوسری بیوی دونوں سے یکساں محبت اور یکساں سلوک کر سکے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں سوالوں کا جواب دیا ہے۔ پہلے سوال کا یہ جواب دیا کہ اگر ایک شخص ایک عورت،

کو پسند نہیں کرتا تو اس سے نکاح ہی کیوں کرے، اگر پسند کر کے نکاح کرتا ہے تو پھر مہر ادا کرے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی واضح فرما دی کہ مہر کا معاملہ اصلاً عورت کا معاملہ ہے۔ وہ اگر اپنی مصلحت کے تحت اپنے شوہر سے کوئی سمجھوتہ کرے تو اس کا اس کو اختیار ہے اور یہی بہتر ہے۔ ویسے مرد کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ دبے ہوئے کو دبانے کے بجائے احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ دیا کہ عدل سے مراد یہ نہیں ہے کہ قلبی میلان اور ظاہری سلوک بالکل کانٹے کی تول برابر برابر ہو۔ اس طرح کا عدل کوئی پوری نیک نیتی سے کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔ مطلوب جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ ظاہری سلوک و معاملات میں روش ایسی رہے کہ دونوں کے حقوق ادا ہوتے رہیں، یہ نہ ہو کہ ایک بیوی بالکل معلقہ بن کے رہ جائے نہ اسے دل کی محبت حاصل ہو، نہ ظاہر کا سلوک، نہ بیوی رہے نہ مطلقہ۔

اس کے بعد بانداز تنبیہ نصیحت فرمائی کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے۔ اس نے اہل کتاب کو بھی اپنے حدود کی پابندی کی ہدایت فرمائی تھی اور اسی کی ہدایت وہ تمہیں بھی کر رہا ہے اگر تم ان کی پابندی کرو گے تو اپنا بناؤ گے، اگر نافرمانی کرو گے تو خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑو گے۔ خدا سب سے بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو بخش دے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو دنیا ہی کے طالب بنتے ہیں وہ دنیا میں سے جتنا مقدر ہوتا ہے اتنا پاتے ہیں اور جو آخرت کے طالب بنتے ہیں تو خدا کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کے خزانے ہیں ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲۷-۱۳۴

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ اَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۚ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۚ وَاِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا

فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٢٨﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ
تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ
فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ
غَفُورًا رَحِيمًا ﴿١٢٩﴾ وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ
اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ﴿١٣٠﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ
وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ
اتَّقُوا اللّٰهَ ۚ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيدًا ﴿١٣١﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ
مَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا ﴿١٣٢﴾ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا
النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيرًا ﴿١٣٣﴾ مَنْ
كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ
وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿١٣٤﴾ ع

١٩ ع ٨ ١٦

ترجمۂ آیات ١٢٧-١٣٤

اور لوگ تم سے عورتوں کے باب میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ اللہ اُن کے
باب میں بھی اور اس حکم کے باب میں بھی جو تمھیں کتاب میں ان عورتوں کے یتیموں کے
بارے میں دیا جا رہا ہے جن کو تم وہ نہیں دیتے جو ان کے لیے لکھا گیا ہے لیکن ان سے
نکاح کرنا چاہتے ہو اور بے سہارا بچوں کے باب میں یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ان کے مہر دو
اور یتیموں کے ساتھ انصاف کرو اور جو مزید بھلائی تم کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے۔
اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بیزاری یا بے پروائی کا اندیشہ ہو تو اس بات میں کوئی

حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی سمجھوتا کرلیں اور سمجھوتا ہی بہتر ہے۔ طبیعتوں میں حرص رچی بسی ہوتی ہے۔ اور اگر تم حسن سلوک کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے تو جو کچھ کروگے اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۱۲۷-۱۲۸

اور تم پورا پورا عدل تو بیویوں کے درمیان کر ہی نہیں سکتے اگرچہ تم اس کو چاہو بھی تو یہ تو نہ ہو کہ بالکل ایک ہی کی طرف جھک پڑو کہ دوسری کو بالکل معلقہ بنا کر رکھ دو اور اگر تم اصلاح کرتے رہوگے اور خدا سے ڈرتے رہوگے تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں گے تو اللہ ان میں سے ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور حکیم ہے۔ ۱۲۹-۱۳۰

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی ہم نے انھیں بھی ہدایت کی اور تم کو بھی کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور اگر تم کفر کروگے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بے نیاز، ستودہ صفات ہے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے، اے لوگو، اور دوسروں کو لائے، اللہ اس چیز پر قادر ہے۔ جو دنیا کے صلے کا طلبگار ہے تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا صلہ موجود ہے اور اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۱۳۱-۱۳۴

۲۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى

بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا (۱۲۷)

سوال کے نقل کرنے میں اجمال ہی بلاغت ہے

'وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَاۗءِ' (وہ تم سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں) میں اسی طرح کا اجمال ہے جس طرح کا اجمال وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ (اور وہ تم سے اشہر حرم کے بارے میں سوال کرتے ہیں) میں ہے۔ وہاں ہم بیان کر آئے ہیں کہ قرآن میں لوگوں کے سوالات بالعموم نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوتے ہیں اور یہی طریقہ قرین بلاغت ہے۔ جب جواب سے سوال کی نوعیت خود واضح ہو جاتی ہے تو سوال کے نقل کرنے میں طولِ کلام کی کیا ضرورت باقی رہی۔

'الکتٰب' سے یہاں مراد اسی سورہ کی آیات ۲-۴ ہیں

'وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ' کا عطف فِيْهِنَّ کی ضمیر مجرور پر ہے اور الکتٰب سے مراد قرآن ہے اور یہاں اشارہ ہے اسی سورۃ کی آیات ۲-۴ کی طرف جن میں بیان کردہ حکم سے متعلق ہی سوالوں کے یہاں جواب دیے گئے ہیں۔ یعنی اللہ عورتوں سے متعلق سوال کا جواب بھی دے رہا ہے اور اس حکم سے متعلق بھی جو تمہیں اسی سورہ کی ابتدائی آیات میں سنایا گیا ہے۔ يُتْلٰى حال کا صیغہ تصویرِ حال کے لیے ہے اس لیے کہ اس وقت یہ آیتیں زیرِ تعلیم بھی تھیں اور ہر حلقے میں زیرِ بحث بھی۔

نکاح میں اولاد مراد عدل کی شرائط کی وضاحت

'فِيْ يَتٰمَى النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ' یہ ان آیات میں بیان کردہ حکم کی طرف اجمالی اشارہ ہے۔ یعنی یہ فتویٰ اس حکم کے بارے میں بھی ہے جو تمہیں ان عورتوں کے یتیم بچوں کے بارے میں دیا گیا ہے جن عورتوں کو تم ان کا حق تو دینے کے لیے تیار نہیں ہو لیکن ان سے نکاح کرنے کے خواہشمند ہو — اس سے ضمناً یہ بات بھی نکل آئی کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ اور وَاٰتُوا النِّسَاۗءَ صَدُقٰتِهِنَّ میں 'نساء' سے مراد یتیموں کی مائیں ہیں، جیسا کہ ہم نے اختیار کیا ہے، اور یہ اشارہ بھی نکلا کہ لوگ یتیموں کی مصلحت سے ان سے نکاح تو کرنا چاہتے تھے لیکن مہر اور عدل کی شرط ان پر شاق تھی۔ مَا كُتِبَ لَهُنَّ کے معنی ہیں جو ان کے لیے خدا کی طرف سے ٹھہرائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح ان کے معاملے میں مہر کی شرط ضروری قرار دی گئی ہے اسی طرح عدل کی شرط بھی ہے۔ اس وجہ سے یہ دونوں چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہوں گی۔

سوال کا جواب اور عربی زبان کا ایک اسلوب

'وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ' یہ وہ فتویٰ ہے جو استفتا کے جواب میں ارشاد ہوا ہے لیکن یہاں عربی زبان کا یہ اسلوب یاد رکھنا چاہیے کہ جب معطوف اس طرح آئے کہ کلام میں اس کا معطوف علیہ موجود نہ ہو تو وہاں وہ باتیں معطوف علیہ کی حیثیت سے محذوف مان لینے کی گنجائش ہوتی ہے جن پر قرینہ دلیل ہو۔ اس کی ایک سے زیادہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی اس کتاب میں اس کی نہایت واضح مثالیں آئیں گی۔ یہاں کلام میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے جو وَاَنْ تَقُوْمُوْا کا معطوف علیہ بن سکے۔ اس وجہ سے لازماً یہاں محذوف ماننا پڑے گا اور یہ محذوف سیاقِ کلام کی روشنی میں معین کیا

جائے گا۔ چنانچہ یہاں وَاَنْ تَقُوْمُوْا سے پہلے یہ مضمون محذوف ہوگا کہ ان عورتوں کو ان کے مہر دو، ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو، پھر اس کے اوپر وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ کا عطف موزوں ہوگا یعنی اور یتیموں کے لیے عدل کی حفاظت کرنے والے بنو۔ گویا فتوے میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ مہر اور عدل کی شرط جس طرح عام عورتوں کے معاملے میں ہے اسی طرح یتیموں کی ماؤں کے بارے میں بھی ہے اور آیات وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا الآیۃ میں عورتوں کے ساتھ عدل کا اور آیت وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ الآیۃ میں ادائے مہر کا جو حکم ہے تو وہ یتیموں کی ماؤں سے متعلق ہی ہے، جن سے تم نکاح تو کرنا چاہتے ہو لیکن مہر اور عدل کی کھکھیڑ میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ اس طرح گویا قرآن نے آیات ۳-۴ کے اجمال کو کھول دیا اور اس فتوے کے ذریعے سے ان میں دیے ہوئے احکام کو مزید مؤکد کر دیا۔

آیت ۱۲۷ کا مطلب تالیف کلام کی روشنی میں

اس آیت کی تاویل میں چونکہ بڑا اختلاف ہے اور یہ اختلاف زیادہ تر نتیجہ ہے کلام کی تالیف نہ سمجھنے کا، اس وجہ سے ہماری توضیح کی روشنی میں کلام کی تالیف پر غور کر کے اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔ اس روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ لوگ عورتوں کے مہر اور مختلف بیویوں کے درمیان عدل کے بارے میں تم سے سوالات کر رہے ہیں، خاص طور پر یتیموں کی ماؤں کے مہر اور ان کے درمیان عدل کے بارے میں کہ جب ان کے ساتھ نکاح میں اصل مصلحت انہی کے بچوں کی ہے تو کیا مہر اور عدل کی شرط ان کے معاملے میں بھی اسی طرح لازمی ہوگی جس طرح دوسری عورتوں کے بارے میں ہے؟ فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ اللہ عام عورتوں کے بارے میں بھی اور یتامیٰ کی ان ماؤں کے بارے میں بھی جن کا حکم آیات ۳-۴ میں بیان ہوا ہے، جن سے تم نکاح تو کرنا چاہتے ہو لیکن ان کے لیے عدل و مہر کے حق کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے، نیز بے بس یتیموں کے باب میں یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ان کے مہر دو، ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو اور یتیموں کے لیے حق و انصاف کے قائم کرنے والے بنو۔ مزید براں جو نیکی اور حسن سلوک تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہوگا اور خدا کے ہاں اس کا صلہ پاؤ گے۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۲۸)

نُشُوْز کے لفظ پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔ 'نُشُوْز' عورت کی طرف سے ہو تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ شوہر کی قوامیت کو تسلیم نہ کرے۔ مرد کی طرف سے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بیوی کے حقوق تسلیم کرنے سے انکار کرے اور اس سے پیچھا چھڑانے پر آمادہ ہو جائے۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ 'شُحّ' کے معنی بخل کے بھی ہیں اور حرص کے بھی۔ بخل تو یہ ہے کہ آدمی ادائے حقوق میں تنگ دلی برتے۔ یہ چیز ہر حال میں مذموم ہے۔ لیکن حرص اچھی چیز کی بھی ہو سکتی ہے، بری چیز کی بھی، حد کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور حد سے باہر بھی، اس وجہ سے اس کا اچھا اور برا ہونا ایک امر اضافی ہے۔ اپنے اچھے پہلو کے اعتبار سے یہ انسانی فطرت کے اندر اپنا ایک مقام رکھتی ہے لیکن اکثر

طبائع پر اس کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ یہ ایک بیماری بن کے رہ جاتی ہے۔ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ میں اس کے اسی پہلو کی تعبیر ہے۔

رشتۂ نکاح کو برقرار رکھنے کے لیے عورت اور مرد دونوں کو ایثار کی ترغیب

یعنی مہر اور عدل تو ہر عورت کا ایک حق شرعی ہے لیکن کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے اگر یہ اندیشہ ہو کہ ان پابندیوں کا بوجھ اگر اس پر اس نے لادے رکھا تو وہ اس کو چھوڑ دے گا یا اس سے بے پروائی برتے گا تو اس امر میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں مل کر آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیں، یعنی عورت اپنے حق مہر، عدل اور نان نفقے کے معاملے میں ایسی رعایتیں شوہر کو دے دے کہ قطع تعلق کا اندیشہ رفع ہو جائے۔ فرمایا کہ صلح اور سمجھوتے ہی میں بہتری ہے اس لیے کہ میاں اور بیوی کا رشتہ ایک مرتبہ قائم ہو جانے کے بعد فریقین کی فلاح اسی میں ہے کہ یہ قائم ہی رہے اگرچہ اس کے لیے کتنا ہی ایثار کرنا پڑے۔ فرمایا کہ حرص، طبائع کی عام بیماری ہے جو باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ یا تو دونوں فریق ایثار پر آمادہ ہوں اور اگر ایک فریق کا مرض لا علاج ہے تو دوسرا قربانی پر آمادہ ہو۔ غرض رشتۂ نکاح کو برقرار رکھنے کے لیے اگر عورت کو قربانی بھی دینی پڑے تو بہتری اس کے برقرار رہنے ہی میں ہے۔ اس کے بعد وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا الآیہ کے الفاظ سے مرد کو اُبھارا ہے کہ ایثار و قربانی اور احسان و تقویٰ کا میدان اصلاً اسی کے شایانِ شان ہے، وہ اپنی فتوت اور مردانگی کی لاج رکھے اور عورت سے لینے والا بننے کی بجائے اس کو دینے والا بنے۔ اللہ ہر ایک کے ہر عمل سے باخبر ہے اور ہر نیکی کا وہ بھرپور صلہ دے گا۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝ (۱۲۹-۱۳۰)

بیویوں کے معاملے میں عدل کا معیار

اب یہ عدل کا مفہوم واضح فرما دیا کہ جس عدل کو تم ناممکن بتا رہے ہو وہ تمہارا اپنا ذہنی عدل ہے۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ دل کا لگاؤ اور ظاہر کا سلوک دونوں بالکل برابر برابر مطلوب ہیں۔ اس وجہ سے یہ بات ناممکن نظر آ رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس معنی میں عدل کا لحاظ تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ اگر تم اس طرح کا عدل کرنا چاہو بھی تو نہیں کر سکو گے۔ دل کا میلان آدمی کے اپنے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ مطلوب جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری بالکل اُدھر میں لٹکتی رہ جائے بلکہ سلوک اور حقوق میں توازن قائم رکھنے اور اگر کوئی حق تلفی اور کوتاہی ہو جائے تو اس کی اصلاح اور تلافی کرنے کی کوشش کرو اور خدا سے ڈرتے رہو۔ اصلاح اور تقویٰ کی اس کوشش کے باوجود اگر کوئی فروگزاشت ہو گئی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ایثار کی حد

اس کے بعد فرمایا کہ شریعت میں مطلوب تو یہی ہے کہ ازدواجی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے لیکن حالات اگر مجبور ہی کر دیتے ہیں اور دونوں میں علیحدگی ہو ہی جاتی ہے تو بہر حال اصل رزاق اور کارساز میاں اور بیوی دونوں کا اللہ ہے۔ وہ ہر ایک کو اپنے فضل سے مستغنی کر دے گا وہ بڑی سمائی رکھنے والا اور حکیم

ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے میاں اور بیوی دونوں سے ایثار اور کوشش تو مطلوب ہے لیکن یہ غیرت اور خودداری کی حفاظت کے ساتھ مطلوب ہے۔ میاں اور بیوی میں سے کسی کے لیے جس طرح اکڑنا جائز نہیں ہے اسی طرح ایک حد خاص سے زیادہ دبنا بھی جائز نہیں ہے۔ اگرچہ الفاظ میں عمومیت ہے لیکن سیاقِ کلام دلیل ہے کہ اس میں عورتوں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی ہے کہ وہ حتی الامکان نباہنے کی کوشش تو کریں اور مصالحت کے لیے ایثار بھی کریں لیکن یہ حوصلہ رکھیں کہ اگر کوشش کے باوجود نباہ کی صورت پیدا نہ ہوئی تو رزاق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اپنے خزانۂ جود سے ان کو مستغنی کر دے گا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ (۱۳۱-۱۳۴)

ان آیات میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الخ کی تکرار کی بلاغت

ایک تو یہ کہ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) بار بار دہرایا گیا ہے۔ دو مرتبہ تو آیت ۱۳۱ ہی میں اور پھر آیت ۱۳۲ میں۔ علاوہ ازیں جہاں سے یہ مضمون چلتا ہے یعنی آیت ۱۲۶، وہاں بھی بعینہٖ یہی ٹکڑا ہے۔ اس مضمون کا بار بار اعادہ بلا سبب نہیں ہے بلکہ خاتمہ سورہ کا مزاج اس کا مقتضی ہوا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ اس خاتمے میں مسلمانوں کو منافقین کو اور اہل کتاب کو آخری تنبیہ کی گئی ہے کہ جو ہدایات تمہاری رہنمائی کے لیے ضروری تھیں، وہ دلائل کی وضاحت کے ساتھ، دے دی گئیں، اب ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے، مانو گے تو تمہارا نفع ہے، نہ مانو گے تو خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑو گے۔ خدا اس پوری کائنات کا بلا شرکت غیرے مالک ہے، اس کی حکومت اپنے بل بوتے پر قائم ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ چونکہ پوری کائنات کا مالک ہے اس وجہ سے اس نے تم سے پہلے اہل کتاب کو بھی اپنے احکام و حدود سے آگاہ کیا اور اب تمہیں بھی اس سے آگاہ کر دیا کہ خدا سے ڈرتے رہو۔ اہل کتاب نے نافرمانی کی تو انھوں نے خود اپنی شامت بلائی۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اسی طرح اگر تم بھی کفر کرو گے تو یاد رکھو کہ خدا تمہارا محتاج نہیں بلکہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ وہ تمہارے لیے کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کو اس کی احتیاج ہے بلکہ اس لیے کہ وہ حمید ہے۔ اس کی اس صفت کا تقاضا ہے کہ بے نیاز ہونے کے باوجود ساری خلق کو اپنے جود و کرم سے نوازے۔ ساری کائنات کا مالک ہونے کی وجہ سے وہی سزاوار ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے اور زندگی کی باگ اس کے حوالہ کی جائے۔ نافرمانی کی صورت میں اگر وہ چاہے تو سب کو فنا کر دے اور اس دنیا میں دوسری مخلوق لا بسائے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔

حذف کا ایک اسلوب

دوسری قابلِ غور چیز آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا الآیۃ میں حذف کا اسلوب ہے ہم پیچھے کسی مقام میں اشارہ کر آئے ہیں کہ عربی میں کلام کے دو متقابل اجزا میں سے بعض اجزا کو اس طرح حذف کر دیتے ہیں کہ مذکور جزو، محذوف کی طرف خود اشارہ کر دیتا ہے ہمارے نزدیک اس آیت کے محذوفات کھول دیے جائیں تو تالیف کلام یہ ہو گی مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، پہلے میں سے فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا کو حذف کر دیا اور دوسرے میں سے وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ کو۔ اس حذف کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ مذکور ٹکڑے محذوف ٹکڑوں کی نشان دہی خود کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو دنیا ہی کے صلے کا طالب ہوتا ہے تو دُنیا کا مالک بھی خدا ہی ہے وہ اس میں سے اس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے اور جو آخرت کا طالب ہوتا ہے تو اللہ اس کو دُنیا میں بھی جو چاہتا ہے دیتا ہے اور آخرت کا صلہ بھی بھرپور عطا فرمائے گا۔ یہ ان لوگوں کو تنبیہ و موعظت ہے جو اپنے دنیوی مفادات کی خاطر خدا کی شریعت سے فرار اختیار کر رہے ہوں۔ فرمایا جو صرف دنیا کا طالب بنتا ہے تو بہر حال اس میں سے وہ پاتا اتنا ہی ہے جتنا خدا کو منظور ہوتا ہے اور آخرت سے وہ بالکل محروم ہی رہتا ہے تو آخرت کا طالب کیوں نہ بنے کہ آخرت کا بھرپور صلہ بھی ملے اور دُنیا میں سے جو مقدر ہو وہ بھی ملے۔ یہی مضمون بعینہٖ آل عمران کی آیات ۱۴۵ اور ۱۴۸ میں بھی گزر چکا ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس کے ساتھ سمیع و بصیر کی صفات کے حوالہ سے مقصود اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ خدا نہ کسی کی دعا و فریاد سے بے خبر ہے نہ کسی کی احتیاج اور حالت اس سے مخفی ہے تو آخر انسان اسی سے کیوں نہ چاہے اور مانگے، دوسروں سے کیوں آرزومند اور دادخواہ ہو۔

۳۸۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۳۵-۱۵۲

آگے پہلے مسلمانوں کو اس فریضۂ منصبی کی یاددہانی فرمائی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو، اہل کتاب کو معزول کر کے، مامور فرمایا ہے۔ پھر منافقین کے خطرات سے ان کو ہوشیار بھی کیا ہے اور منافقین کو تنبیہ بھی کی ہے۔ نظم کلام بالکل واضح ہے۔

آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳۵-۱۵۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا

فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ
تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِىْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ
الْكِتٰبِ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ
كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا
لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ
بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ
لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ
اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى
يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ
الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِىْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ
بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ
كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ
مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ
اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ ع ۲۰ ۱۷ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ
اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ

النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ
لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ
سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ
دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ
نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا
دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ
اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ
وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ
الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا
اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا
بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ
سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

الجزء ۶

ع ۲۱/۱۱

ترجمہ آیات ۱۳۵-۱۵۲

اے ایمان والو، حق پر جمے رہو اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے۔

اگرچہ یہ شہادت خود تمھاری اپنی ذات، تمھارے والدین اور تمھارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کا سب سے زیادہ حق دار ہے تو تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر کج کروگے یا اعراض کروگے تو یاد رکھو کہ اللہ، جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اے ایمان والو، ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری۔ اور جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روز آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر کفر میں بڑھتے گئے، اللہ نہ ان کی مغفرت فرمانے والا ہے اور نہ ان کو راہ دکھانے والا ہے۔ منافقوں کو خوش خبری دے دو کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ان کے لیے جو مسلمانوں کے مقابل میں کافروں کو دوست بنائے ہوئے ہیں۔ کیا ان کے ہاں عزت ورسوخ چاہتے ہیں، عزت تو سراسر اللہ کے لیے ہے۔ ۱۳۵-۱۳۹

اور وہ کتاب میں تم پر یہ ہدایت نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ آیات الٰہی کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو تا آنکہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں ورنہ تم بھی انہی کے مانند ہو جاؤ گے۔ اللہ منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔ ان کو جو تمھارے لیے گردشوں کے منتظر ہیں۔ اگر تمھیں اللہ کی طرف سے کوئی فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کوئی جیت ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر چھائے نہیں رہے اور

ہم نے مسلمانوں سے تم کو بچایا نہیں، تو اللہ ہی فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اور اللہ کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا۔ ۱۴۰-۱۴۱

منافقین خدا سے چالبازی کرنا چاہتے ہیں حالانکہ چال وہ ان سے چل رہا ہے اور جب یہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو الکسائے ہوئے اٹھتے ہیں محض لوگوں کے دکھلانے کے لیے اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ درمیان ہی میں لٹک رہے ہیں، نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر۔ اور جسے اللہ گمراہ کردے تو تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ ۱۴۲-۱۴۳

اے ایمان والو، مسلمانوں کے مقابل میں کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کرا لو۔ ۱۴۴

منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے اور تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو توبہ اور اصلاح کرلیں گے اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑیں گے اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرلیں گے وہ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ ایمان والوں کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ ۱۴۵-۱۴۶

خدا کو تمہیں عذاب دینے سے کیا نفع ہے اگر تم شکرگزاری اختیار کرو اور ایمان لاؤ۔ اللہ تو بڑا قبول فرمانے والا اور جاننے والا ہے۔ ۱۴۷

اللہ بدزبانی کو پسند نہیں کرتا مگر یہ کہ کوئی مظلوم ہو۔ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اگر تم نیکی کو ظاہر کرو گے یا اس کو چھپاؤ گے یا کسی برائی سے درگزر کرو گے تو اللہ معاف کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ ۱۴۸-۱۴۹

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا کفر کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے

رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی راہ نکالیں، یہی لوگ درحقیقت پکے کافر ہیں اور ہم نے ان کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ان کو ان کا اجر دے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ۱۵۰-۱۵۲

۳۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۳۵)

'كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ'۔ 'قسط' کے لفظ پر آل عمران کی آیات ۱۸ اور ۲۱ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اس سے مراد حق و عدل کی وہ میزان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی شکل میں عطا فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہارا ہر قول و فعل اسی باٹ اور اسی ترازو سے تولا ہوا ہو اور تم اسی پر قائم رہنے والے اور اسی کو قائم کرنے والے بنو۔ 'شُهَدَآءَ لِلّٰهِ' یعنی مجرد اس پر قائم رہنا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تم دنیا کے سامنے اللہ کی طرف سے اس کے داعی اور گواہ بھی ہو جیسا کہ فرمایا ہے 'وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا' اور اسی طرح ہم نے تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہی دے۔

'وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ' یعنی یہ میزان عدل صرف لینے ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ دینے کے لیے بھی ہے سو اگر اس کا فیصلہ کسی معاملے میں تمہارے، تمہارے والدین کے اور تمہارے اقربا کے خلاف ہو جب بھی تمہیں اسی پر قائم رہنا اور اسی کی گواہی دینا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ یہود کو جو کتاب دی گئی تو وہ اس کی وہ باتیں تو مانتے تھے جو اپنی خواہشوں کے مطابق پاتے لیکن جو باتیں ان کی خواہشوں کے خلاف پڑتیں ان سے کنی کاٹ جاتے۔

عدل پر قائم ہو خواہ اپنے حق میں ہو یا اپنے خلاف

'اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا' یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کے لیے اور باٹ سے تولو، غریب کے لیے اور باٹ سے، قوی اور بااثر کے لیے الگ قانون و شریعت ہو، کمزور و بے اثر کے لیے الگ حکم ہو گا،

امیر و غریب دونوں کے لیے ایک ہی باٹ اور ایک ہی ترازو

بلکہ سب کو اللہ کے ایک ہی قانونِ عدل کے تحت ہونا چاہیئے اس لیے کہ اللہ کا حق سب پر یکساں قائم ہے اور یہ حق دوسرے تمام حقوق سے بڑا ہے۔ اگر کوئی شخص امیر اور با اثر ہے تو اس وجہ سے وہ خدا کے حق سے بری الذمہ نہیں ہو جاتا کہ وہ خدا کے قانون کی ذمہ داریوں سے بری کر دیا جائے اور اس کے ساتھ کسی اور قانون کے تحت معاملہ کیا جائے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنے کے لیے حضورؐ کے اس ارشاد کو سامنے رکھیے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں۔

جب ایک مخزومیہ عورت نے چوری کی تو اس کے معاملے کی قریش کو بڑی فکر ہوئی۔ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کرے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اس کی جرأت صرف اسامہؓ بن زید کر سکتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے چہیتے ہیں۔ لوگوں کے کہنے پر اسامہؓ نے حضورؐ سے اس کی سفارش کی۔ حضورؐ نے فرمایا، اسامہ، تم اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کرنے آئے ہو، پھر آپ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا، لوگو، تم سے پہلے قوموں کو اسی چیز نے تباہ کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کرنے کا۔ میں تو اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ (متفق علیہ)

'اتباعِ ہوٰی' ہدی اللہ کی ضد ہے

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا، 'ھویٰ'، 'ھدی اللہ' کی ضد ہے یعنی اگر تم نے اللہ کی یہ ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہشوں اور بدعتوں کی پیروی کی تو تم اس قسط سے ہٹ جاؤ گے جس پر اللہ تعالیٰ نے تم کو قائم کیا ہے اور جس کی دعوت اور شہادت پر تم مامور کیے گئے ہو۔

نظامِ قسط کو بگاڑنے کی دو صورتیں

وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا اس میں اس نظامِ قسط کو بگاڑنے کی دو شکلوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کو کج کرنے، بگاڑنے اور مسخ کرنے کی کوشش کی جائے جیسا کہ یہود نے کیا اور جس کا ذکر آل عمران کی آیت ۸، یَلْوٗنَ اَلْسِنَتَھُمْ بِالْکِتٰبِ الایۃ میں ہوا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو بگاڑنے کی کوشش تو نہ کی جائے، اس کی شکل باقی رہے لیکن زندگی کے معاملات میں اس کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ فرمایا کہ ان میں سے جو ظلم بھی کرو گے خدا اس سے بے خبر نہیں رہے گا اور جب بے خبر نہیں رہے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس جرمِ عظیم کی سزا دیے بغیر بھی نہ چھوڑے گا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۱۳۶)

زبان کا ایک اسلوب

'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا' ہم دوسرے مقام پر زبان کا یہ اسلوب واضح کر چکے ہیں کہ فعل اپنے

ابتدائی اور ظاہری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اپنے حقیقی اور کامل معنی میں بھی۔ یہاں مسلمان من حیث الجماعت مخاطب ہیں جن میں خام و پختہ، ناقص و کامل اور مخلص و منافق ہر قسم کے عناصر شامل تھے۔ ان سب کو خطاب کرکے تنبیہ فرمائی ہے کہ اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو، سچے اور پکے مومن بن جاؤ۔ گویا خطاب تو عام ہے لیکن رُوئے سخن خام کاروں اور مدعیوں کی طرف ہے۔

قرآن سے پہلے اصل کتاب الٰہی کی حیثیت صرف تورات کو حاصل ہے

'وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ' میں کتاب سے مراد تورات ہے۔ واحد سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے اصل کتاب الٰہی کی حیثیت درحقیقت تورات ہی کو حاصل ہے، دوسرے انبیا کے صحیفوں کی حیثیت مستقل بالذات صحیفوں کی نہیں ہے اس لیے کہ ان انبیا میں سے سب تورات ہی کے داعی بن کر آئے۔ یہاں تک کہ حضرت مسیح بھی درحقیقت تورات ہی کو قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان انبیا کے صحیفوں میں جو تعلیم ہے وہ تورات سے کوئی الگ شے نہیں بلکہ اسی کے احیاء و تجدید کی دعوت اور اسی کے حکم و اسرار کا اظہار و بیان ہے۔ اس وجہ سے باعتبارِ حقیقت تو ایک ہی کتاب ہے لیکن ظاہر کا لحاظ کیا جائے تو جمع بھی قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن نے دونوں طرح سے ذکر کیا ہے اور اس سے مقصود اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ ظاہری تعدد کو جن نادانوں نے تفریق بین الرسل کا ذریعہ بنایا ان کو اپنی حماقت پر تنبیہ ہو۔

'اَنْزَلَ' اور 'نَزَّلَ' میں فرق

یہاں 'نَزَّلَ' اور 'اَنْزَلَ' کا فرق بھی قابلِ توجہ ہے۔ جو لوگ عربی زبان کی باریکیوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ 'اَنْزَلَ' کا مفہوم تو مجرد اتار دینا ہے لیکن 'نَزَّلَ' کے اندر اہتمام اور تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ لفظوں کا یہ فرق تورات اور قرآن دونوں کے اتارے جانے کی نوعیت کو واضح کر رہا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔ کسی موزوں محل میں ہم اس پر وضاحت سے گفتگو کریں گے۔

آیت سابق اور لاحق کے درمیان بیچ کی کڑی ہے

اس آیت میں ایمان کے جو اجزا مذکور ہوئے ہیں ان سب پر تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بحث ہو چکی ہے۔ یہاں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیت اوپر کی آیت اور آگے کی آیات کے درمیان بیچ کی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک طرف تو یہ اس کلمۂ جامعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو امت وسط اور قائم بالقسط امت کا کلمہ ہے یعنی بلا تفریق تمام انبیا و رسل اور تمام آسمانی صحیفوں پر ایمان جو اس بات کی شہادت ہے کہ یہ امت عدل و قسط پر قائم ہے، یہود و نصاریٰ کی طرح تعصب و تحزب کے جنون میں مبتلا ہو کر اس نے حق و عدل کی شاہراہ نہیں چھوڑی۔ دوسری طرف یہ ان منافقین کے ذکر کی تمہید ہے جو یا تو خود یہود میں سے تھے یا درپردہ ان کے زیرِ اثر تھے۔ اس وجہ سے بعینہٖ انہی گمراہیوں میں مبتلا تھے جو یہود کا ورثہ تھیں چنانچہ بعد کی آیات سے اس حقیقت کا پوری طرح انکشاف ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (۱۳۷-۱۳۸)

اہل کتاب کے اندر سے آئے ہوئے منافقین کا کردار

اہل ایمان کا صحیح موقف و مقام واضح کرنے کے بعد منافقین کی طرف توجہ فرمائی کہ جو لوگ ایمان لائے پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر ہی میں بڑھتے گئے، یہ خدا کی مغفرت اور ہدایت کے سزاوار نہیں ہیں، ان منافقین کو خدا کے دردناک عذاب کی بشارت پہنچا دو۔ یہ بات کہ یہاں ذکر منافقین ہی کا ہے خود قرآن کی ان آیات ہی سے واضح ہے۔ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ کے الفاظ سے خود یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ یہ کن لوگوں کا کردار بیان ہوا ہے۔ البتہ یہ سوال قابل غور ہے کہ یہ ایمان پھر کفر، پھر ایمان، پھر کفر کی حالت جو ان کی بیان ہوئی ہے یہ محض ان کے تذبذب کی ایک تصویر ہے یا بیان واقعہ ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ بیان واقعہ ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ یہ منافقین زیادہ تر اہل کتاب بالخصوص یہود میں سے تھے اور انہی کے زیر اثر بھی تھے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو ان کے ایمان و کفر کا ایک کھیل تو وہ ہے جو وہ تورات کے ساتھ پہلے کھیل چکے ہیں اور دوسرا کھیل یہ ہے جو وہ اسلام کے ساتھ کھیل رہے ہیں کہ پہلے آگے بڑھ کر اس کے ماننے کا اقرار کیا اور اب رات دن اس کے خلاف سازشیں کرنے کے درپے ہیں۔ فرمایا کہ اب ان کو خدا نہ تو بخشنے کا ہے نہ ان کو کوئی اور راہ دکھانے کا ہے۔ کوئی اور راہ دکھانے سے مطلب یہ ہے کہ اب ان پر حجت تمام ہو چکی ہے، اب ان کے مزید امتحان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب ان کے لیے صرف جہنم کی راہ باقی رہ گئی ہے۔ آگے اس مضمون کو اس طرح واضح فرما دیا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ ۱۶۷-۱۶۸ (جن لوگوں نے کفر کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے، اللہ نہ تو ان کو بخشنے کا ہے اور نہ کوئی اور راستہ ان کو دکھانے کا ہے بجز جہنم کے راستے کے) اسی مضمون کو یہاں بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا سے تعبیر فرمایا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (۱۳۹-۱۴۰)

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ میں سورۂ انعام آیت ۶۸ کا حوالہ ہے

۱ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ، میں حوالہ ہے سورۂ انعام کی آیت ۶۸ کا۔ وہاں فرمایا ہے۔ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (اور جب تم ان کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں کج بحثیاں کر رہے ہیں تو ان سے اعراض کرو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر تمھیں شیطان یہ بات فراموش کرا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالموں کے پاس نہ بیٹھو) پھر یہی مضمون اسی انعام کی آیت ۷۰ میں بھی بیان ہوا ہے۔

مجالس میں اللہ کی آیات کا مذاق

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْاٰيَة ، یہ منافقین کی صفت بیان ہوئی ہے کہ یہ مسلمانوں کے بالمقابل کفار یعنی یہود کو اپنا دوست اور کارساز بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں عزت و سرخروئی حاصل کرنے کے آرزومند ہیں حالانکہ عزت و ذلت سب خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ یہ ان کی مجالس میں حاضری دیتے ہیں جہاں اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن میں یہ صریح ہدایت نازل ہو چکی ہے کہ جب دیکھو کہ اللہ کی آیات کا کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو، یہاں تک کہ یہ مذاق اڑانے والے کسی اور بات میں لگ جائیں۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو یہ بھی انھیں کا ساتھی بن جاتا ہے اس لیے اللہ ایسے منافقوں کو انہی کافروں کے ساتھ دوزخ میں جمع کرے گا۔

جن مجلسوں میں اللہ کے دین اور اس کی شریعت کا تمسخر ہو ان میں اگر کوئی مسلمان شریک ہو تو یہ اس کی بے حمیتی اور بے غیرتی کی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں شرکت کو اپنے لیے وجہ عزت و شرف سمجھے تو یہ صرف بے حمیتی کی ہی نہیں بلکہ اس کے مسلوب الایمان ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اس قسم کے منافقوں کا حشر انھی لوگوں کے ساتھ ہو گا جن کے ساتھ خدا کے دین کے استہزا میں یہ شریک رہے ہیں۔ اس آیت سے دعوتِ دین کے بعض اہم اصول بھی نکلتے ہیں لیکن ان پر گفتگو کے لیے موزوں مقام سورۂ انعام میں آئے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۱۴۱)

استحوذ علیہ کا مفہوم

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں اَحَاطَ بِهٖ ، غلبه ، استولی علیه اس کو گھیرے میں لے لیا۔ اس پر غالب آگیا۔ نر، مادہ کو جب اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے، کسی دوسرے نر کو اس کی طرف بڑھنے نہیں دیتا تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ یعنی يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمُ الدَّوَآئِر تمھارے لیے گردشوں کے منتظر رہتے ہیں۔

منافقین کی دو طرفہ سازباز

یہ انھی منافقین کے کردار کی مزید تفصیل ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے نہایت بدخواہ ہیں۔ یہ ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تمھیں کوئی افتاد پیش آئے، کوئی ٹھوکر لگے، تم شکست کھاؤ۔ تمھیں فتح حاصل ہو تو کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہیں تھے اور اگر کہیں دشمن کا پلہ بھاری ہو جاتے تو ان کے پاس پہنچیں گے اور ان کو یقین دلائیں گے کہ یہ تو ہماری تدبیر تھی کہ تم مسلمانوں سے محفوظ رہے۔ ہم اس طرح تمھیں بچاتے رہے کہ مسلمان تم پر کھل کر حملہ نہ کر سکے اور ان کا پورا دباؤ تم پر نہ پڑ سکا۔ فرمایا کہ آج یہ ان سخن سازیوں سے کام چلا رہے ہیں لیکن ایک دن آئے گا کہ سارے حالات بے نقاب ہو جائیں گے اس دن خدا تمھارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا اور تمھارے مقابل میں ان کی کچھ پیش نہ جائے گی۔ اس دن یہ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ کا دعویٰ نہ کر سکیں گے۔

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ج وَإِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ۝ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ قلے لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ط وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (۱۴۲-۱۴۳)

'يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ' کے ہر پہلو پر پوری تفصیل کے ساتھ سورہ بقرہ کی آیت ۹ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

منافقین کے تذبذب کی تصویر

'مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ'۔ 'ذَبْذَبَ الشَّيْءُ' کے معنی ہیں، چیز فضا میں ٹنگی ہوئی حرکت کر رہی ہے۔ 'ذَبْذَبَ الرَّجُلُ' کے معنی ہیں آدمی حیران و متردد ہے۔

'بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ' یعنی نہ مسلمانوں کے ساتھ نہ کفار کے ساتھ، دونوں کے بیچ میں حیران و درماندہ، کبھی مسلمانوں کے پاس جا کر ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں، کبھی کفار کے پاس پہنچ کر ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں حالانکہ ساتھ کسی کے بھی نہیں، دو گلوں کے بیچ میں بھٹکنے والی بکری کے مانند کبھی اس گلے میں شامل ہو جاتے ہیں کبھی دوسرے گلے میں۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'كُسَالٰى'، 'يُرَآءُوْنَ' اور 'مُذَبْذَبِيْنَ' تینوں حال پڑے ہوئے ہیں۔ ان تینوں کو بیک وقت چشم تصور کے سامنے لائیے تب صحیح تصویر سامنے آئے گی۔

اللہ کے ساتھ دھوکا بازی کرنے والا خود دھوکے میں ہے

مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین صرف اللہ کے بندوں ہی کو دھوکا نہیں دے رہے ہیں بلکہ خدا کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ جو خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے وہ خدا کو دھوکا نہیں دیتا بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اس لیے کہ خدا اس کی رسی دراز کر دیتا ہے جس سے وہ سمجھتا ہے کہ اس نے خدا کو دھوکا دے دیا ہے حالانکہ دھوکا اس نے خدا سے کھایا۔ 'وَإِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ الاٰية' یہ ان کی اس دھوکا بازی کی مثال ہے یعنی نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو طبیعت پر جبر کر کے، الکسائے ہوئے، مارے باندھے محض اس ڈر سے اٹھتے ہیں کہ اگر شریک جماعت نہ ہوئے تو مسلمانوں کے رجسٹر سے نام ہی خارج ہو جائے گا۔ یہ محض دکھاوے کی نماز ہوتی ہے کہ مسلمان ان کو اپنے اندر شامل سمجھیں اس وجہ سے اس میں اللہ کا ذکر اتنا ہی ہوتا ہے جتنا مجبوری اور دکھاوے کی نماز میں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ صریح دھوکہ بازی ہے۔ فرمایا یہ خدا کے راندے ہوئے ہیں، اس نے ان کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اور جن کو خدا نے بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہو اب ان کو راہ پر کون لا سکتا ہے۔

صدر اول میں مسجد کی حاضری ایمان اور کفر کے درمیان علامت فارق تھی

اس آیت سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اس دور میں مسجد کی حاضری ایمان اور کفر کے درمیان ایک علامت فارق کی حیثیت رکھتی تھی۔ جو شخص بلا کسی عذر معلوم کے مسجد سے غیر حاضر رہتا اس کے لیے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا ہی ناممکن ہو جاتا۔ ایک یہ دور تھا یا اب یہ دور آیا ہے کہ مسجد اور جماعت کی حاضری تو درکنار سرے سے نماز پڑھنا ہی مسلمان سمجھے جانے بلکہ مسلمانوں کا لیڈر

مانے جانے کے لیے بھی ضروری نہیں رہا۔ یا للعجب!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (۱۴۴)

'الکٰفِرِیْنَ' اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ مراد اس سے وہی اہل کتاب ہیں جن سے منافقین کا سانباز تھا 'مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ' کی قید یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ کفار کو دوست اور حلیف بنانا اسی حالت میں ممنوع ہے جب یہ مسلمانوں کے بالمقابل ہو۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

'سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا' واضح اور قطعی حجت۔

مسلمانوں کے بالمقابل کفار سے دوستی دلیل کفر ہے

خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن منافقین ہی کی طرف ہے کہ مسلمانوں کے بالمقابل کفار کو اپنا دوست اور ساتھی نہ بناؤ۔ یہ جرم کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ اس جرم کا ارتکاب کر کے تم اپنے خلاف اللہ کو ایک ایسی حجت قاطع دے دو گے کہ پھر تمہارے لیے کسی عذر کی گنجائش باقی نہ رہ جائے گی۔ تمہارا کفر بالکل قطعی اور تمہارا سزاوار دوزخ ہونا بالکل مبرہن ہو جائے گا۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (۱۴۵-۱۴۷)

'الدرک الاسفل' کا مفہوم

'الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ'، 'درک' کے معنی اقصی قعر الشیٔ یعنی کسی شے کا سب سے نچلا حصہ۔

'دین' بمعنی اطاعت

'وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ' لفظ 'دین' کے مختلف معانی پر ہم کہیں بحث کر چکے ہیں۔ ازاں جملہ اس کے معنی اطاعت کے بھی ہیں مثلاً قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (۱۱ - زمر) (کہہ دو مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں اس کی مخلصانہ اطاعت کے ساتھ)

منافقین کا درجہ کفار سے بھی نیچے ہے

یہ منافقین کو آخری تنبیہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ کفر صریح کے بالمقابل ان کا یہ مذبذب ایمان بھی تو بہر حال کچھ قیمت رکھتا ہی ہے۔ فرمایا کہ نہیں، یہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے یعنی ان کا درجہ کٹر اور معاند کفار کے درجے سے بھی نیچے ہے۔ توبہ کے سوا کوئی چیز بھی ان کو اس انجام سے نہیں بچا سکتی۔ اور اس توبہ کے لیے اصلاح، اعتصام باللہ اور اخلاص کی شرط ہے۔ اصلاح یعنی اپنے رویے کی اصلاح کریں، اعتصام یعنی اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑیں، اخلاص یعنی اللہ و رسول کی مخلصانہ اطاعت کریں، بغیر کسی تذبذب اور ریا کے۔ فرمایا کہ تب یہ آخرت میں مسلمانوں کے ساتھ ہو سکتے ہیں، اور یہ اطمینان رکھیں کہ اللہ کے ہاں اہل ایمان کے لیے بڑا اجر ہے۔ اس کے بعد خود ان منافقین کو مخاطب کر کے، بانداز التفات فرمایا کہ خدا کو تمہیں عذاب دینے میں کوئی نفع نہیں ہے اگر تم شکر گزار بنو اور ایمان اختیار کرو تو اللہ بڑا قدر دان اور ہر ایک کے ایمان و عمل سے اچھی طرح باخبر ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ فلسفۂ دین کے اعتبار سے شکر ہی پیچھے ایمان کا سرچشمہ ہے۔ نیز یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ بعض مرتبہ نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ شکر کی نسبت جب خدا کی طرف ہوتی ہے تو اس کے معنی قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں باتوں پر دوسرے مقام میں بحث گزر چکی ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْۗءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (۱۴۸-۱۴۹)

تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے

یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی ایک تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ آیت ۸۶ میں گزر چکی ہے جس طرح وہاں منافقین سے جب اعراض کا حکم ہوا تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ جو تمھیں سلام کرے تم اس کے سلام کا جواب دو اور مقصود اس سے یہ تھا کہ مبادا پرجوش مسلمان ان لوگوں سے سلام کلام ہی بند کر دیں جن پر ان کو منافقت کا شبہ ہو جائے۔ اسی طرح یہاں اوپر والی آیات میں منافقین کے لیے چونکہ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ تک کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ مسلمان علانیہ سخت الفاظ میں منافقین کی برائیوں کا اظہار و اعلان شروع کر دیں گے اس وجہ سے یہ ہدایت کر دی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے، دوسروں کے لیے اللہ اس کو پسند نہیں فرماتا۔

جماعتی زندگی کی ایک اہم ہدایت

یہ بات چونکہ جماعتی زندگی کے نہایت اہم مسائل میں سے ہے اس وجہ سے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جماعتی زندگی میں کسی گروہ کے اندر اگر کوئی ایسی برائی جڑ پکڑ رہی ہو یا پکڑ چکی ہو جو پوری جماعت کے لیے خطرہ بن سکتی ہو تو اس کا تدارک ضروری ہوتا ہے اور اس تدارک کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس برائی کی قباحت و شناعت، اس کے نتائج بد اور اس کے مرتکبین کے انجام کو اچھی طرح واضح کر دیا جائے تاکہ جماعت کے افراد اس کے شر سے محفوظ رہیں لیکن ساتھ ہی اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ جماعت کے عام افراد عام صیغہ سے کہی ہوئی بات کو مجرد اپنے اندازے، قیاس اور گمان کی بنا پر معین اشخاص پر منطبق کرنا نہ شروع کر دیں۔ اس سے نہ صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے بے گناہ اشخاص تہمتوں کے ہدف بن جائیں گے بلکہ جماعت میں انتشار و فساد پیدا ہو جانے کا خطرہ بھی ہے۔ یہاں منافقین سے متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں، دیکھ لیجیے، بالکل عام صیغے سے بیان ہوئی ہیں اور مقصود یہ ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ اگر اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح کر لیں اور اگر وہ اصلاح نہ کریں تو کم از کم مسلمان اپنے آپ کو ان فتنوں سے محفوظ رکھیں۔ اس حد تک یہ چیز نہ صرف یہ کہ ٹھیک ہے بلکہ جماعتی بقا کے لیے ناگزیر ہے لیکن اگر یہی چیز یہ شکل اختیار کر لے کہ اس کو دلیل بنا کر عام افراد تعین کے ساتھ ایک دوسرے کو ہدف مطاعن بنانا شروع کر دیں کہ تو منافق ہے، تو کافر ہو گیا اور فلاں فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کا سزاوار ہے تو پوری جماعت میں ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ اس فتنے کے سدباب کے لیے یہ ہدایت فرما دی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار و اعلان صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جس

پر شخصاً ظلم ہوا ہے۔ اس صورت میں ظلم، ظالم اور مظلوم تینوں معین ہوں گے اور قانون اس کا مداوا کرسکے گا جب تک یہ شکل نہ ہو بات عام صیغے ہی سے کہنی چاہیے جس طرح قرآن نے کہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں بھی جب اس طرح کی کوئی برائی آتی تو آپ ہمیشہ عام صیغے ہی سے اس پر لوگوں کو ملامت فرماتے۔ آپ کا عام انداز کلام یہ ہوتا 'مَا بَالُ قَوْمٍ يَفْعَلُوْنَ كَذَا وَكَذَا' ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے جو اس اس طرح کے کام کرتے ہیں۔ البتہ جب کوئی متعین شخص کسی متعین جرم کے ساتھ سامنے آتا تو اس پر قانون کے مطابق گرفت فرماتے۔

صفاتِ الٰہی کے ذکر سے مقصود ان کا لازم ہے

'وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا' بطور تنبیہ ہے یعنی کوئی شخص اگر اس ہدایت کے خلاف روش اختیار کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ہم ایک سے زیادہ مقامات پر یہ اصول بیان کرچکے ہیں کہ اس طرح جب صفاتِ الٰہی کا حوالہ آتا ہے تو مقصود اس سے ان کا لازم ہوتا ہے یعنی جب خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے تو اس پر وہ گرفت بھی لازماً فرمائے گا۔

پسندیدہ روش کا بیان

'اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا الاية' خدا کو جو روش ناپسند ہے اس کو بیان فرمانے کے بعد یہ پسندیدہ روش کا بیان ہے۔ فرمایا کہ پسندیدہ روش یہ ہے کہ آدمی اچھی بات کا اظہار کرے، اچھا جذبہ دل میں پرورش کرے اور دوسروں کی برائیوں سے درگزر کرے۔ اس کے بعد اپنی دو صفتوں — عفو اور قدیر — کا حوالہ دیا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ خدا ہر طرح کی قدرت رکھنے کے باوجود لوگوں کی برائیوں سے درگزر فرماتا ہے۔ اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اس کی ان صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی پایا جائے۔ آدمی طاقت رکھتا ہو کہ وہ کسی کو ترکی بہ ترکی جواب دے سکے لیکن اس کے باوجود وہ درگزر کر جائے تو یہ عفو ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۱۵۰-۱۵۲)

اہل کتاب کفر کا فرد ہیں

ان آیات میں اہل کتاب کی جو فرد قرارداد جرم بیان ہوئی ہے اس کے ہر جزو پر مفصل بحث پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ البتہ ان کا موقع و محل وضاحت طلب ہے۔ اوپر آیت ۱۳۹ کے تحت یہ بات گزر چکی ہے کہ لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ میں کافرین سے مراد اہل کتاب ہیں۔ اگرچہ اہل کتاب کا کفر بالکل واضح ہے لیکن حیلہ جو طبیعتیں، جو ان سے ساز باز رکھنا چاہتی تھیں، اپنے روابط ان سے کاٹنے کے لیے تیار نہ تھیں، وہ اپنے اس رویے کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ حیلہ شرعی تراشتی تھیں کہ اہل کتاب بہر حال اہل کتاب ہیں، ان کے اندر دین کے نقطۂ نظر سے کچھ خرابیاں ہوسکتی ہیں اور ہیں لیکن ان خرابیوں کی بنا پر ان کو

بالکل کفار کی صف میں کھڑا کر دینا اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔ قرآن نے انھی حیلہ بازوں کے اس فریب کا ان آیات میں پردہ چاک کیا ہے اور نہایت صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ پکے کافر تو درحقیقت یہ اہل کتاب ہی ہیں اس لیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرتے ہیں جن کو خدا نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے ان میں سے جس کو چاہتے ہیں مانتے ہیں جس کو چاہتے ہیں نہیں مانتے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا پر ایمان اپنے شرائط پر لانا چاہتے ہیں نہ کہ خدا کے شرائط پر، حالانکہ ایمان صرف وہ معتبر ہے جو خدا کے شرائط پر ہو۔ اگر ایمان کی شرطیں یہی مقرر کریں گے اور رسولوں کا انتخاب یہ اپنی ہی صواب دید پر کریں گے تو پھر خدا کی خدائی کہاں رہی۔ پھر تو خدا کا منصب انھوں نے خود ہی سنبھال لیا۔ فرمایا کہ ان کے کٹر کافر ہونے میں ذرا شبہ نہیں اور ایسے برخود غلط اور مغرور کافروں کے لیے ہم نے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ مومن صرف وہ لوگ شمار ہوں گے جو اللہ اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے، ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی۔ یہ لوگ بے شک اپنا اجر پائیں گے۔ خدا غفور رحیم ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ کفر صرف یہی نہیں ہے کہ کوئی شخص صریح لفظوں میں خدا اور رسولوں کا انکار کرے بلکہ یہ بھی کفر اور صریح کفر ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کو تو مانے لیکن اپنی شرائط پر۔

۴۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۵۳-۱۶۲

آگے اہل کتاب — یہود اور نصاریٰ — کو تنبیہ ہے اور یہ تنبیہ اتنی سخت و شدید ہے کہ لفظ لفظ سے جوش غضب اُبلا پڑ رہا ہے۔ پوری تقریر از ابتدا تا انتہا صرف فرد قرارداد جرائم پر مشتمل ہے اور کلام کے جوش اور روانی کا یہ عالم ہے کہ بات شروع ہونے کے بعد یہ متعین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ختم کہاں ہوئی۔ اس قسم کے پرجوش اور پرغضب کلام میں عموماً خبر حذف ہو جاتی ہے، گویا متکلم کا جوش ہی خبر کا قائم مقام بن جاتا ہے اور مبتدا ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ متکلم کیا کہنا چاہتا ہے — آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵۳-۱۶۲

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا

لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا
نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ
حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾
وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ
وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ
مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ
رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾
فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ
وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ
نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ
الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ
اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع ۲۲ ۱۰ ۲

ترجمۂ آیات ۱۵۳-۱۶۲

اہل کتاب تم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم ان پر براہِ راست آسمان سے ایک کتاب
اُتار دو۔ یہ تعجب کی بات نہیں، موسیٰ سے تو انھوں نے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔

انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہمیں تم اللہ کو کھلم کھلا دکھا دو۔ تو ان کو ان کی اس زیادتی کے باعث کڑک نے آدبوچا۔ پھر نہایت واضح نشانیاں آچکنے کے بعد انھوں نے گوسالے کو معبود بنا لیا۔ ہم نے اس سے درگزر کیا اور موسٰی کو ہم نے نہایت واضح حجت عطا کی۔ اور ہم نے ان کے اوپر طور کو معلق کیا ان کے عہد کے ساتھ اور ہم نے ان کو کہا کہ دروازے میں داخل ہو سر جھکائے ہوئے اور ان کو کہا کہ سبت کے معاملے میں حکم عدولی نہ کرنا۔ اور ہم نے ان سے ایک مضبوط عہد لیا۔ ۱۵۳-۱۵۴

پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے عہد کو توڑا، بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، بوجہ اس کے کہ انھوں نے انبیاء کو ناحق قتل کیا اور بوجہ اس کے کہ انھوں نے کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں ــــ بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے تو وہ کم ہی ایمان لائیں گے ـــ اور بوجہ ان کے کفر کے اور بوجہ ان کے مریم پر ایک بہتان عظیم لگانے اور بہ سبب ان کے اس دعوے کے کہ ہم نے مسیح بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا ـــ حالانکہ نہ تو انھوں نے اس کو قتل کیا، نہ سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ اس کے معاملے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، ان کو اس بارے میں کوئی قطعی علم نہیں بس گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ قتل اس کو انھوں نے ہرگز نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۱۵۵-۱۵۸

اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہے جو اس کی موت سے پہلے اس کا یقین نہ کر لے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔ ۱۵۹

پس ان یہودیوں کے ظلم کے سبب سے ہم نے بعض پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کر دیں جو ان کے لیے حلال تھیں اور بوجہ اس کے کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے ہیں اور بوجہ اس کے کہ وہ سود لیتے ہیں حالانکہ اس سے ان کو روکا گیا ہے اور بوجہ اس کے کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ البتہ ان میں جو علم میں راسخ اور صاحب ایمان ہیں وہ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی اور خاص کر نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم اجر عظیم دیں گے۔ ۱۶۰-۱۶۲

۴۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۞ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۞ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۞ (۱۵۳-۱۵۵)

ان آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے جن واقعات کا حوالہ ہے۔ وہ بلا استثنا سب کے سب سورۂ بقرہ کی تفسیر میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیات ۴۷-۹۹

'بظلمھم' کا مفہوم

'بِظُلْمِهِمْ' یعنی اس کڑک کو انھوں نے اپنی بدبختی سے خود دعوت دی۔ یہ اللہ نے ان کے اوپر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا۔ انھوں نے ایک ایسے تجربے کے لیے ضد کی جس کی وہ تاب نہیں لا سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کی زد میں آ گئے۔

'سلطان مبین' سے مراد

'سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا' سے مراد وہ حجت قاطع ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزات کی شکل

ہیں عطا فرمائی۔ یہ معجزات ایسے مسکت اور قاہر تھے کہ ان کے بعد کسی انصاف پسند کے لیے کسی تردد کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

رفع طور اور میثاق

'وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ' میں 'ب' میرے نزدیک تلبس کے مفہوم میں ہے۔ بقرہ آیت ۶۳ کے تحت ہم نے رفع طور کی حقیقت بھی واضح کی ہے اور اس کا مقصد بیان کیا ہے کہ اس قدرت قاہرہ کے اظہار سے مقصود بنی اسرائیل پر یہ واضح کرنا تھا کہ جس خدا سے یہ معاہدہ کر رہے ہو اس کے ہاتھ میں یہ پہاڑ کو ہلا دینے والی طاقت بھی ہے۔ اگر معاہدہ کر چکنے کے بعد اس کو توڑا تو یاد رکھو کہ اس عہد شکنی کی سزا سے تمھیں کوئی نہ بچا سکے گا۔ یہاں اسی حقیقت کو اس طرح مصوّر کیا ہے کہ خدا نے ان کے اوپر طور کو بھی اٹھایا اور اس کے ساتھ معاہدہ کو بھی کہ یہ معاہدہ ہے اور یہ پہاڑ، اگر اس معاہدے کی بے حرمتی ہوئی تو اسی پتھر سے تمھارا سر کچل دیا جائے گا۔

'بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا' جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے قول 'قُلُوْبُنَا غُلْفٌ' کا مفہوم اور اس جملہ معترضہ کی بلاغت اور اس کی حقیقت سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکی ہے۔

بلاغت کا ایک اسلوب

اس پورے رکوع میں بلاغت کا یہ اسلوب قابل توجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی ایک طویل فہرست تو سنا دی گئی ہے لیکن الفاظ میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اس فہرست کے سنانے سے مدعا کیا ہے جرائم کی فہرست کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ آگیا ہے اور اس کے ختم ہوتے ہی پھر ان کے جرائم کے بیان کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اقتضائے کلام سے ایک اور طویل جملہ معترضہ آگیا ہے اور اس کے بند ہوتے ہی پھر فہرست جرائم شروع ہو گئی۔ یہ اسلوب بیان، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، متکلم کے زور بیان اور جوش، سامع کی ذہانت اور ہوش، دعوے کی قوت اور وضاحت اور فیصلہ کے مستغنی عن البیان ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ خطبائے عرب کے خطبات میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن میں بھی آگے اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس طرح کے پر زور کلام کو ایک صاحب ذوق سامع سمجھ تو سکتا ہے لیکن اس کے زور اور اس کی بلاغت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

کلام کا مدعا اپنے الفاظ میں

مطلب یہ ہے کہ یہود تم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ قرآن اور تمھاری رسالت پر اس وقت ایمان لائیں گے جب تم ان کے اوپر آسمان سے اس طرح ایک کتاب اتارو کہ وہ اس کو اترتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ تم ان کے اس مطالبے پر تعجب نہ کرو۔ یہ جن اسلاف کے خلف ہیں وہ اپنے پیغمبر سے اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر مطالبہ کر چکے ہیں۔ یہ تو صرف کتاب ہی اترتے دیکھنا چاہتے ہیں، انھوں نے تو یہ مطالبہ کیا تھا کہ تم ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھاؤ، جب تک تم خدا کو نہ دکھاؤ گے ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ تم سے ہم کلام ہوتا ہے اور تم اس کے فرستادہ ہو۔ چنانچہ اس طرح انھوں نے خود اپنی شامت بلائی اور ان کو ایک کڑک نے آدبوچا۔ پھر اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ انھوں نے نہایت واضح معجزات دیکھنے

کے بعد بھی ایک بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ لیکن ہم نے ان سے درگزر کیا اور موسیٰ کو نہایت واضح حجت عطا کی تاکہ ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ ہم نے ان سے میثاق لینے کے موقع پر ان کے سروں پر طور کو لٹکا دیا، ان کو خیمۂ عبادت میں فروتنی کے ساتھ داخل ہونے کی ہدایت کی، ان کو حکم دیا کہ سبت کی بے حرمتی نہ کرنا اور ان سب باتوں کے لیے ان سے نہایت مضبوط میثاق لیا لیکن انھوں نے کسی عہد کی بھی پروا نہ کی بلکہ ہر عہد کو توڑا، اللہ کی آیات کا انکار کیا، انبیاء کو بے گناہ قتل کیا، اور کہا کہ ہمارے دلوں کے دروازے تو تمھاری باتوں کے لیے بند ہیں۔ یہ بند نہیں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر مہر کر دی ہے تو یہ شاذ و نادر ہی ایمان لائیں گے ـــــ ان باتوں کے حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جن کی تاریخ یہ ہے، جن کا قومی مزاج یہ ہے، ان سے کس خیر کی امید کی جا سکتی ہے، ان کے ان مسلسل جرائم کے سبب سے، جن کا سلسلہ اسلاف سے لے کر اخلاف تک کہیں ٹوٹا نہیں ہے، خدا نے ان پر لعنت کر دی ہے، اب کوئی سا معجزہ بھی تم ان کو دکھا دو، معجزات دیکھنے کی تو نس باقی ہی رہے گی، ایمان کی سعادت ان کو ہرگز حاصل نہیں ہوگی۔

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ۝ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۱۵۶-۱۵۸)

'وَبِكُفْرِهِمْ' کا عطف

'وَبِكُفْرِهِمْ' کا عطف اوپر کے سلسلۂ کلام پر ہے۔ بیچ میں جملہ معترضہ آ گیا تھا اس کے ختم ہونے کے بعد پھر فہرست جرائم شروع ہو گئی۔

حضرت مریمؑ پر بہتان کی نوعیت

'وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ' میں جس بہتان عظیم کا ذکر ہے اس کے متعلق سورۂ آل عمران کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہود نے یہ الزام سیدنا مسیحؑ کے دور میں لگانے کی جرأت نہیں کی۔ یہ تمام تر بعد کی ایجادات میں سے ہے۔ 'إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ' میں 'رَسُولَ اللَّهِ' کا لفظ ہمارے نزدیک یہود کے قول کا جزو نہیں ہے بلکہ ان کے جرم کی سنگینی کو واضح تر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سیدنا مسیحؑ کے مرتبہ کو واضح فرما دیا ہے۔

واقعہ قتل مسیح کی تردید کا مقصد

'وَمَا قَتَلُوهُ' سے 'عَزِيزًا حَكِيمًا' تک جملہ معترضہ ہے۔ اس میں یہود کے دعوائے قتل مسیح کی فوری تردید کر دی گئی ہے۔ اس فوری تردید سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے رسول اس کی حفاظت میں ہوتے ہیں، ان کے خلاف اس کے دشمنوں کی چالیں خدا کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اس وجہ سے یہود کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے ان کو قتل کیا، یا سولی دی بالکل بے بنیاد ہے۔ وہ اپنی اس شرارت میں بالکل ناکام رہے۔ البتہ ایک جھوٹے دعوے کا بار اپنے سر لے کر ہمیشہ کے لیے مبغوض و ملعون بن گئے۔ دوسرا یہ کہ نہ کہیں مسیحؑ کے قتل کا واقعہ پیش آیا نہ سولی کا لیکن پال (PAUL) کے متبع نصاریٰ نے اس فرضی افسانے کو لے کر اس پر ایک پوری دیومالا (MYTHOLOGY) تصنیف کر ڈالی اور اس طرح پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھے۔

وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ

وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ: یعنی یہود جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ تو وہ کر نہ پائے البتہ صورت حالات ایسی بنا دی گئی کہ وہ یہی سمجھے کہ انھوں نے مسیح کو سولی دلوا دی ہے۔ یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ اس کی شکل کیا ہوئی۔ جس واقعہ کے بارے میں خود ان لوگوں کے درمیان، جیسا کہ انجیلوں سے ثابت ہے، شدید اختلاف ہو جو اس وقت موجود تھے اب دو ہزار سال کے بعد اس کی شکل متعین کرنے کی کوشش کرنا محض اٹکل کے تیر تکے چلانا ہے۔ قطعی بات بس اتنی ہی ہے جو قرآن نے بتائی ہے کہ حضرت مسیح کو یہود نہ تو قتل کر سکے نہ سولی دے سکے بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا۔

واقعہ کی نوعیت انجیلوں کی روشنی میں

واقعے کی جو روداد انجیلوں میں موجود ہے اس سے چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس وقت ملک پر رومیوں کی حکومت تھی اور وہی تمام سیاسی و تعزیری اختیارات کے مالک تھے۔

دوسری یہ کہ رومی حکام اور پولیس کو نہ صرف یہ کہ حضرت مسیح کو سولی دینے سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ رومی حاکم پیلاطوس اور دوسرے حکام اس ظلم کی ذمہ داری کسی طرح بھی اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

تیسری یہ کہ گرفتاری اور سزا کے وقت کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں وہ ایسے ہنگامہ خیز ہیں کہ ایسے حالات کے اندر عوام کو ہر بات باور کرائی جا سکتی تھی اور وہ بڑی آسانی سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ مان سکتے تھے۔

چوتھی یہ کہ سولی کے مزعومہ واقعے کے بعد بھی انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کے شاگردوں نے ان کو دیکھا۔

پانچویں یہ کہ سیدنا مسیح کے وعظوں، ان کے معجزوں اور ان کے کارناموں کی تو بڑی دھوم تھی لیکن اس وقت تک صورۃً نہ وہ عوام ہی میں اچھی طرح متعارف تھے اور نہ رومی حکام اور ان کی پولیس کے آدمی ہی ان کو پہچانتے تھے۔

چھٹی یہ کہ خود نصاریٰ میں بھی ایک جماعت شروع سے اس بات کی قائل رہی ہے کہ سولی حضرت مسیح کو نہیں دی گئی بلکہ ایک اور ہی شخص کو دی گئی لیکن مشہور یہ کر دیا گیا کہ انھی کو سولی دی گئی۔

ان تمام باتوں کے دلائل خود انجیلوں میں موجود ہیں اور نہایت آسانی سے ہم ان کو جمع کر سکتے ہیں لیکن اس سے بس اتنی ہی بات ثابت ہو گی جو قرآن نے بتا دی ہے کہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا۔ رہا یہ سوال کہ اس گھپلے کی شکل کیا ہوئی تو اس باب میں جو کچھ بھی کہا جائے گا اس کی حیثیت ظن و گمان سے کچھ زیادہ نہیں ہے اور ہم گمان کے پیچھے پڑنا پسند نہیں کرتے۔

یکی پرانے شگون پر اپنی ناک کٹوا بیٹھے

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ، سے مراد نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ میں نفس واقعے سے متعلق بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بڑا اختلاف ہے اور اس پر جو دیومالا (MYTHOLOGY) انھوں نے تصنیف کی ہے اس میں بھی بڑے اختلافات ہیں اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے اس بات کا کہ انھوں نے اپنے سارے علم کلام کی بنیاد حقیقت کے بجائے محض ظن پر رکھی اور اس طرح جس سولی سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح کو محفوظ رکھا نصاریٰ نے اس پر خود چڑھ کر خودکشی کر لی۔

رفع سے مجرد ترقی درجات لینا عربیت کے خلاف ہے

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا، رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کے ٹکڑے پر ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں بحث کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس سے مجرد ترقی درجات و مراتب لینا عربیت کے خلاف ہے۔ عزیز حکیم کی صفات کے حوالے سے مقصود یہاں یہ ہے کہ خدا جب کسی کام کو کرنا چاہے تو وہ اپنے ارادے پر غالب ہے۔ اس کے لیے کوئی راہ بھی بند نہیں ہے، وہ جہاں سے چاہے اپنی تدبیر و حکمت سے راہ کھول لیتا ہے۔

اصل سلسلۂ کلام

یہ امر ملحوظ رہے کہ اصل مسئلہ زیر بحث ان آیات میں حضرت مسیح کے قتل یا سولی کی تردید یا ان کے رد و قبول کا نہیں ہے۔ یہ بات، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، محض ایک ضمنی بات کے طور پر، سلسلۂ کلام کے بیچ میں آگئی ہے۔ اصل سلسلۂ کلام جو يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ سے چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لانے کے لیے جو بہانے بنا رہے ہیں وہ سب بہانے ان کی اس خوئے بد کے کرشمے ہیں جو ابتدا ہی سے ان کی سرشت میں داخل ہے۔ انھوں نے ایک سے ایک بڑھ کر معجزے دیکھے لیکن کوئی معجزہ ان کو مطمئن نہ کر سکا۔ انھوں نے ہمیشہ عہد شکنی کی، ہمیشہ تکذیب کی اور ہر حق کا مقابلہ ضد اور مکابرت، تکبر اور سرکشی سے کیا۔ یہاں تک کہ مریم پر بہتان لگایا اور خدا کے رسول مسیح ابن مریم کے قتل کرنے کے خود مدعی ہیں۔ ——— جب بات یہاں تک پہنچی تو ضمنی طور پر قتل اور سولی کے واقعہ کی تردید فرما دی اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی تنبیہ فرما دی کہ انھوں نے بھی بے سمجھے بوجھے اسی جھوٹ کو سچ مان کر اس پر پورے علم کلام کا محل تعمیر کر دیا۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (۱۵۹)

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ سے مراد یہود اور نصاریٰ دونوں ہیں

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کا اسلوب بیان تعمیم کو ظاہر کر رہا ہے، یعنی یہ یہود و نصاریٰ دونوں گروہوں پر مشتمل ہے اگرچہ اوپر سے ذکر یہود ہی کا چلا آرہا تھا لیکن چونکہ جملہ معترضہ میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا نصاریٰ کی حماقت کا بھی ذکر آگیا تھا اس وجہ سے ان کے حوالے کے لیے بھی تقریب پیدا ہو گئی اور یہاں جو بات بیان ہوئی ہے وہ دونوں گروہوں سے بحیثیت گروہ کے متعلق ہے، بحیثیت افراد کے نہیں۔

ایمان کا لفظ یقین کرنے کے معنی میں

لَيُؤْمِنَنَّ میں لام، تاکید اور قسم کا ہے اور ایمان کا لفظ یہاں یقین کرنے کے معنی میں ہے۔ دین میں معتبر ایمان صرف وہ ہے جو یقین، تصدیق اور اقرار تینوں اجزا پر مشتمل ہو۔ اس کے علاوہ ایک وہ ایمان ہے جس کے اندر یقین اور تصدیق کے اجزا تو نہیں پائے جاتے لیکن اظہار و اقرار کا جزو پایا جاتا ہے، یہ منافقین کا ایمان ہے۔ اسی طرح ایک وہ ایمان بھی ہے جس کے اندر یقین تو پایا جاتا ہے لیکن اس کے اندر تصدیق اور اقرار کے اجزا مفقود ہوتے ہیں، یہ متکبرین اور متمردین کا ایمان ہے۔ ان پر حق کا حق ہونا تو بالکل واضح ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنی رعونت اور شرارت کی وجہ سے اس کی تصدیق و اقرار سے گریز کرتے ہیں اور اپنی اس شرارت کو مختلف بہانوں کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورۂ نمل میں اسی گروہ کا ذکر ہوا ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۱۴ (اور ان لوگوں نے ظلم اور گھمنڈ کے سبب سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا) اسی کے تحت وہ ایمان بھی ہے جو غرق ہوتے وقت فرعون لایا تھا۔

ہر چند اس کے ایمان میں ایمان کے تمام اجزا موجود تھے لیکن جو ایمان پانی سر سے گزر چکنے کے بعد لایا جائے اس ایمان کا دین میں کوئی درجہ نہیں ہے۔ آیت زیرِ بحث میں ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ایمان سے مراد یقین ہے۔

لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ اور قَبْلَ مَوْتِهِ میں پہلی ضمیر کا مرجع ہمارے نزدیک قرآن مجید ہے اور دوسری کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج یہ اہل کتاب قرآن اور نبی کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ وہ آسمان سے کتاب اترتی ہوئی دکھائیں تب وہ یقین کریں گے کہ قرآن فی الواقع اللہ کی کتاب ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی اللہ کے رسول ہیں اور اس حیلے سے وہ ان تمام عقلی، نقلی، فطری اور تاریخی دلائل کو نظر انداز کر رہے ہیں جو قرآن اور پیغمبر کی صداقت کے ثبوت میں موجود ہیں لیکن وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب یہ یہود اور نصاریٰ قرآن اور پیغمبر کی کہی ہوئی ایک ایک بات کو واقعات کی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور قرآن ان کے لیے جس رسوائی و نامرادی اور جس ذلت و شکست کی خبر دے رہا ہے وہ پیغمبر کے دنیا سے اٹھنے سے پہلے پہلے اس طرح ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے گی کہ اس کو جھٹلانا ان کے لیے ممکن نہیں رہے گا اگرچہ ایمان کی سعادت ان کو یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوگی۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ جملہ قسمیہ ہے اس وجہ سے اس کو مجرد خبریہ جملہ کے مفہوم میں لینا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ پیغمبر کے دنیا سے اٹھنے سے پہلے پہلے یہ لوگ قرآن کا یقین کر لیں گے بلکہ اس کے اندر تہدید اور وعید بھی ہے۔ یعنی آج جو باتیں دلیل سے انھیں سمجھائی جا رہی ہیں لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں کل واقعات کی شکل میں جب ان کے سامنے آجائیں گی تب یہ کیا کریں گے، اس وقت تو انھیں ماننی ہی پڑیں گی اگرچہ وہ زبانوں سے لاکھ انکار کرتے رہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سلف میں سے عکرمہ پہلی ضمیر کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں لیکن عام طور پر لوگوں نے اس بُعد کے سبب سے جو ایک طویل جملہ معترضہ نے پیدا کر دیا ہے، اس قول کو اہمیت نہیں دی، حالانکہ جملہ معترضہ سے جو بُعد پیدا ہوتا ہے وہ قابلِ لحاظ نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اس سے صرفِ نظر کر کے سلسلۂ کلام کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا یہ اس شہادت کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن ان تمام لوگوں پر دیں گے جن پر آپ نے اس دنیا میں دینِ حق کی شہادت دی ہے۔ اس شہادت کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۴۱ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم نے وضاحت کے ساتھ اس پر بحث کی ہے۔ یہ شہادت اگرچہ تمام انبیا اپنی امتوں پر دیں گے، چنانچہ حضرت مسیح جو شہادت دیں گے اس کا ذکر بھی مائدہ کی آیات ۱۱۷-۱۱۶ میں ہوا ہے لیکن آنحضرت صلعم چونکہ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ نے یہود، نصاریٰ اور اہل عرب سب پر یہ واضح فرمایا ہے کہ اللہ کا اصل دین کیا ہے اس وجہ سے آپ ہی کا یہ منصب ہے کہ آپ قیامت کے دن یہ بتائیں کہ آپ نے لوگوں کو اللہ کی طرف سے کیا بتایا اور آپ کی اسی شہادت سے لوگوں پر حجت قائم ہوگی۔

'لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ' پر ضمیر کا مرجع

یہ مجرد خبر نہیں بلکہ تہدید ہے

عکرمہ کی رائے

آنحضرت صلعم کی شہادت دنیا اور آخرت دونوں میں

یہ جملہ بھی ہمارے نزدیک اسی تہدید و وعید کا حامل ہے جس کا حامل پہلا جملہ ہے۔ یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و حقانیت اس دنیا میں بھی ان اہل کتاب پر اس طرح واضح ہو جائے گی کہ ان کے لیے مجال انکار باقی نہ رہے گی اور آخرت میں بھی آپ شہادت دیں گے کہ یہود و نصاریٰ کی ایک ایک ضلالت پر آپ نے ان کو اچھی طرح متنبہ کر دیا تھا، ان تنبیہات کے بعد بھی اگر یہ اپنی انھی گمراہیوں میں پڑے رہے تو یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہے، ان پر حجت تمام ہو چکی تھی۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۶۰-۱۶۱)

یہود پر جائز چیزوں کے حرام ہونے کی نوعیت

'فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ' میں لفظ 'ظلم' کی تقدیم سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہود پر حلال چیزیں جو حرام ہوئیں تو یہ بھی خود انھی کے اپنے نفس پر ظلم کرنے کے سبب سے حرام ہوئیں، اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ جائز چیزوں کے حرام کیے جانے کی ان کے ہاں جو صورتیں پیدا ہوئیں ان پر ہم بقرہ کی تفسیر میں بھی گفتگو کر چکے ہیں اور آل عمران کی آیت ۹۰ کے تحت بھی اس پر بحث ہو چکی ہے۔

سود کی حرمت کا حکم احبار میں

'وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ' سود کی حرمت کا صریح حکم احبار باب ۲۵: ۳۵-۳۸ میں ملاحظہ ہو۔

'وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ' کے مفہوم پر اسی سورہ کی آیت ۲۹ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔

یہود کے اصل موانع ایمان

ان باتوں کا تعلق بھی یہود کی اسی فہرست جرائم سے ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن اور پیغمبر پر ایمان لانے میں ان کے لیے جو چیزیں مانع ہیں وہ دراصل ان کے یہ جرائم ہیں نہ یہ کہ تم ان کو آسمان سے کوئی صحیفہ اترتا ہوا نہیں دکھا رہے ہو۔ یہ ہمیشہ سے گردن کش اور نافرمان ہیں۔ انھوں نے اپنی گردن کشی ہی سے اپنے اوپر حلال چیزیں حرام کرائیں، اور اپنی گردن کشی ہی کے سبب سے ہمیشہ حق کی راہ میں روڑا بنے اور یہی چیز ہے جس نے ان کو آمادہ کیا کہ انھوں نے سود کو جائز کر لیا حالانکہ تورات میں ان کو صریح الفاظ میں اس کی ممانعت کی گئی تھی اور اسی کے سبب سے انھوں نے حرام خوری کے دوسرے تمام دروازے بھی کھول لیے حالانکہ یہ ان دروازوں کو بند کرنے پر مامور کیے گئے تھے۔ جن کا کردار یہ ہو ان سے کس طرح توقع کرتے ہو کہ وہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر بھی قرآن پر ایمان لائیں گے۔ فرمایا کہ ان میں سے جتنے بھی کفر پر جم گئے ہیں، ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا (۱۶۲)

'راسخون فی العلم' سے مراد اہل کتاب کے علمائے حقانی ہیں

'لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ' 'رَاسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ' سے مراد وہ علما ہیں جن کے قدم علم شریعت میں خوب جمے ہوئے ہو عقیدہ اور عمل ہر چیز میں راسخ اور کردار و اخلاق ہر پہلو سے جادۂ مستقیم پر استوار تھے۔ یہود میں علما کم نہیں تھے، بے شمار تھے، لیکن شریعت ان کے لیے بس ایک نمائشی جامے

کا حیثیت، رکھتی تھی جس کو پہن کر وہ باہر بازاروں اور عوام میں نکلا کرتے۔ ان کے فکر و نظر اور ان کے قلب و رُوح سے اس علم کو کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ علماء ان تمام جرائم میں، جو اوپر مذکور ہوئے، اپنی قوم کے نہ صرف شریک تھے بلکہ وہی ان میں ان کے مرشد تھے اس وجہ سے ان سے تو اگر کسی چیز کی توقع کی جا سکتی تھی تو صرف اسی چیز کی کہ وہ قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اپنی قوم کی پیشوائی کریں۔ البتہ ان میں جو نفوس قدسیہ حکمت دین کی لذت سے آشنا تھے ان کے قدم علم شریعت میں راسخ تھے۔ اس وجہ سے ان کو اپنی قوم کی متفقہ مخالفت کے طوفان کے مقابلے کے لیے کھڑے ہونے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ملی۔ یہاں انھی نفوس قدسیہ کو عام علمائے یہود سے ممتاز کرنے کے لیے علما کے بجائے 'رٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ' کے لقب سے مشرف فرمایا ہے۔ یعنی یہ آندھی کے خس و خاشاک کی طرح ہوا کے رُخ پر اڑنے والے نہیں ہیں بلکہ چٹانوں کی طرح اپنے موقفِ حق پر جمنے والے ہیں۔

'الْمُؤْمِنُوْنَ' سے مراد سلیم الفطرت اور خدا ترس افراد ہیں

'الْمُؤْمِنُوْنَ' سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں جو اگرچہ رٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کا درجہ تو نہیں رکھتے تھے لیکن اپنی فطرت کی سلامتی، دل کی صلاحیت اور کردار کی پاکیزگی کے اعتبار سے تمام سوسائٹی میں ممتاز تھے اور یہود کے عام بگاڑ کے باوجود وہ خدا کی ہدایت و شریعت پر قائم رہے اور جب اسلام کی دعوت ان کے کانوں میں پڑی تو وہ اس کو بھی قبول کرنے کے لیے آگے بڑھے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یہ خبر ہے۔ یعنی یہ راسخین فی العلم علماء اور سلیم الفطرت لوگ اس قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اس سے پہلے کی کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اہل کتاب کا یہی گروہ ہے جس کی تعریف جگہ جگہ قرآن نے فرمائی ہے۔ آل عمران کی آیت ۱۱۳ کے تحت بھی اس گروہ کا ذکر گزر چکا ہے۔

'وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ' کا اسلوب اور اس کے فوائد

'وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ' عطف تو ہے 'الْمُؤْمِنُوْنَ' پر لیکن یہ منصوب ہو گیا ہے فصیح عربی کے اس قاعدے کے مطابق جس کو ہمارے اہل نحو 'علیٰ سبیل الاختصاص' یا 'علیٰ سبیل مدح' کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ شعرائے عرب کے کلام میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ اسلوب کی اس تبدیلی کا لفظی اثر تو سامع پر یہ پڑتا ہے کہ یہ تنوع اس کو لفظ پر متوجہ کر دیتا ہے اور معنوی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محض اسلوب کی تبدیلی سے، بغیر ایک حرف کے اضافے کے، اس کے اندر اختصاص اور مدح و تعریف کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہی لفظ اپنے عام اسلوب کے مطابق 'وَالْمُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ' ہوتا تو اس کے معنی صرف یہ ہوتے کہ 'اور نماز کے قائم کرنے والے' لیکن جب اسلوب بدل کر 'وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ' کہہ دیا تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ 'اور خاص کر نماز کو قائم کرنے والے' جس سے ان موصوفین کی غیر معمولی تعریف اور ان کی خصوصیت بھی واضح ہوئی اور نماز کی وہ اہمیت و عظمت بھی جو دین کے نظام میں اس کو حاصل ہے۔ اس اسلوب کی ایک نہایت عمدہ مثال سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں فرمایا ہے۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ (۱۷۷- بقرہ) (اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے جب کہ عہد کر بیٹھیں اور خاص کر وہ لوگ جو ثابت قدم رہنے والے ہیں فقر و فاقہ، جسمانی تکالیف اور جنگ کی آزمائشوں میں)۔ یہاں بھی دیکھ لیجیے 'وَالصّٰبِرِيْنَ' معطوف تو ہے

'وَالْمُوْفُوْنَ' پر، اس اعتبار سے اس کو 'وَالصّٰبِرُوْنَ' ہونا تھا لیکن اسی قاعدے کے مطابق جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا الصّٰبِرِیْنَ ہو گیا۔

شریعت میں صبر اور نماز کا درجہ

یہاں حکمتِ دین کے اس رمز کو سمجھنے کے لیے کہ شریعت میں صبر اور نماز کا کیا درجہ ہے آیت اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ الآیہ کی تفسیر، جو بقرہ میں گزر چکی ہے، پڑھ لیجیے تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے کہ ان دونوں چیزوں کے اس اہتمام و تاکید کے ساتھ ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے۔ جہاں تک صبر کا تعلق ہے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس شخص کے اندر صبر کی صفت نہ ہو اس کے دین کی عمارت تمام تر ریت پر ہے، وہ کسی بھی جھٹکے سے آسانی سے گر سکتی ہے۔ رہی نماز تو درحقیقت یہی وہ چیز ہے جو اس عہد کی برابر یاددہانی کرتی ہے جو بندہ اپنے رب سے کرتا ہے اس وجہ سے جو شخص اس کو ضائع کر دے گا وہ بالآخر پورے دین کو ضائع کر بیٹھے گا۔ یہود کے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے کہ انھوں نے نماز بالکل ضائع کر دی تھی (اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ ۵۹۔ مریم) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پورے دین ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان میں سے صرف وہی لوگ دین پر قائم رہے جو نماز پر قائم رہے اور یہی لوگ ہیں جو بالآخر اسلام کی دعوت قبول کرنے والے بھی بنے۔ اسی گروہ کا ذکر آلِ عمران میں اس طرح ہوا ہے۔ لَیْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ ۱۱۳ (سب اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو دین پر قائم ہیں، شب کے وقتوں میں آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتے اور سجدہ کرتے ہیں) وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ، بالکل بقرہ کی آیت وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ کی طرح ہے۔ جس طرح وہاں یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ اور دوسری صفات کے ذکر کے بعد بظاہر اس ٹکڑے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی لیکن یقینِ آخرت کو، جو تمام خیر و تقویٰ کا اصل محرک ہے، نمایاں کرنے کے لیے اس کا ذکر فرمایا اسی طرح یہاں بھی بظاہر وَالْمُؤْمِنُوْنَ کے بعد دوبارہ اس کے اعادے کی ضرورت نہیں تھی لیکن آخرت کی تذکیر کے لیے اس کا اعادہ فرمایا اس لیے کہ دین میں تمام زندگی اور حرکت آخرت پر ایمان ہی سے ہے۔

۴۲۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۶۳-۱۷۵

آگے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے پہلے تسلی دی ہے کہ تم ان مخالفوں کی کوئی پروا نہ کرو جو آج تم پر نازل شدہ وحی کو نہیں مانتے بلکہ آسمان سے اتری ہوئی کھلی کتاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ نہ وحی دنیا میں ایسی انجانی چیز ہے جس کا تجربہ دنیا میں کبھی کو ہوا ہو اور نہ نبوت و رسالت ایسی اجنبی چیز ہے جس کا اظہار تمھی نے کیا ہو۔ وحی بھی دنیا میں تم سے پہلے آ چکی ہے اور رسول بھی بے شمار آ چکے ہیں، اگر ایک ایسی جانی پہچانی ہوئی چیز سے لوگ بھڑکتے ہیں اور جس کے جانچنے اور پرکھنے کے لیے اتنے معیارات اور اتنی کسوٹیاں موجود ہیں لوگ اس کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں تو قصور تمھارا نہیں بلکہ خود انھی کا ہے۔ تمھارے اطمینان

کے لیے تو یہ چیز بس کرتی ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی شہادت تمھارے حق میں ہے۔ رہے یہ لوگ جو کفر اور مخالفت پر اڑ گئے ہیں تو انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہیں اور اس کے سبب سے اب یہ اس قابل نہیں رہ گئے ہیں کہ ان کے لیے ایمان و ہدایت کی راہ کھلے۔ اب تو ان کے لیے صرف جہنم کی راہ باقی رہ گئی ہے۔

اس کے بعد لوگوں کو عام طور پر اور نصاریٰ کو خاص طور پر خطاب کر کے تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ نے قرآن کی شکل میں جو نور مبین خلق کی رہنمائی کے لیے اتارا ہے اس کی قدر کرو اور ضلالت کی راہ چھوڑ کر ہدایت کی راہ پر آجاؤ ورنہ یاد رکھو کہ جو لوگ اس سے اعراض و انکار کریں گے وہ بڑے ہی دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے ـــ اب آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶۳-۱۷۵

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ
أَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْأَسْبَاطِ وَ
عِيْسٰى وَأَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿١٦٣﴾
وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ
وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿١٦٤﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ
لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾
لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
يَشْهَدُوْنَ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿١٦٦﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٦٧﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا
لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿١٦٨﴾ إِلَّا طَرِيْقَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿١٦٩﴾ يٰٓأَيُّهَا
النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ
وَإِنْ تَكْفُرُوْا فَإِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا

حَكِيمًا ﴿۱۷۰﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا
الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا
إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۖ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ
انتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ
وَلَدٌ ۘ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿۱۷۱﴾ لَّن (ع ۲۳ ۴)
يَسْتَنكِفَ الْمَسِيحُ أَن يَكُونَ عَبْدًا لِّلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ۚ
وَمَن يَسْتَنكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ
جَمِيعًا ﴿۱۷۲﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ
أُجُورَهُمْ وَيَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنكَفُوا
وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ
اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿۱۷۳﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن
رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ﴿۱۷۴﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ
وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ
إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿۱۷۵﴾

ترجمۂ آیات ۱۶۳-۱۷۵

ہم نے تمھاری طرف اسی طرح وحی کی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد آنے والے
نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب
یونس، ہارون اور سلیمان پر وحی بھیجی۔ اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی اور دوسرے بھی بہت
سے رسولوں پر وحی بھیجی جن کا حال ہم تم کو پہلے سُنا چکے ہیں اور بہت سے رسولوں کا حال

نہیں سنایا اور موسیٰ سے تو اللہ نے کلام کیا۔ اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۱۶۴-۱۶۵

پر اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جو اس نے تم پر نازل کی ہے۔ اس نے اس کو اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور گواہی کو تو اللہ ہی کافی ہے بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو تو خدا نہ بخشنے کا ہے اور نہ جہنم کے سوا جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے، ان کو کوئی اور رستہ دکھانے کا ہے اور اللہ کے لیے یہ بات آسان ہے۔ ۱۶۶-۱۶۹

اے لوگو، رسول تمھارے پاس تمھارے رب کے پاس سے حق لے کر آ گیا ہے۔ پس ایمان لاؤ، اسی میں تمھاری بہتری ہے اور اگر کفر پر جمے رہو گے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ ڈالو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا دعویٰ نہ کرو۔ باز آ جاؤ۔ یہی تمھارے حق میں بہتر ہے۔ معبود تو بس تنہا اللہ ہی ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کارساز بس ہے اور مسیح کو ہرگز اللہ کا بندہ بننے سے عار نہ ہوگا اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہوگا اور جو اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا

تو اللہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔ پس جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے تو ان کو تو ان کا پورا پورا اجر بھی دے گا اور اپنے فضل میں سے بھی ان کو مزید بخشے گا اور جنھوں نے عار اور تکبر کیا ہو گا ان کو دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے بالمقابل نہ کسی کو اپنا دوست پائیں گے نہ مددگار۔ ۱۷۰-۱۷۳

اے لوگو، تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے ایک حجت آچکی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایک نورِ مبین اُتار دیا تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کو انھوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا ان کو وہ اپنی رحمت اور اپنے فضل میں داخل کرے گا اور انھیں اپنی طرف سیدھی راہ کی ہدایت بخشے گا۔ ۱۷۴-۱۷۵

۴۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ۞ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا (۱۶۳-۱۶۴)

لفظ 'اسباط' پر سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔

زبور

'زبور' کے نام سے ایک صحیفہ حضرت داؤد کی دعاؤں اور مناجاتوں پر مشتمل تورات کے مجموعہ میں شامل ہے۔ قرآن میں اس کا نام معرفہ کی شکل میں بھی آیا ہے۔ یہاں نکرہ کی صورت میں میرے نزدیک تفخیم شان کے لیے ہے جس سے زبور کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اگرچہ موجودہ زبور کو تورات کے دوسرے صحیفوں ہی کے درجے میں رکھنا صحیح ہے۔ اس میں ترجمہ کے نقائص بھی ہیں اور کمی بیشی کا بھی خاصا امکان ہے تاہم اس کو پڑھیے تو سینہ ایمان و توکل کے نور سے لبریز ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ سے مکالمۂ الٰہی کی نوعیت

'وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا' پر ہم دوسرے مقام میں گفتگو کر چکے ہیں۔ تورات اور قرآن دونوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے خاص خطاب و کلام سے نوازا ہے اور اس خطاب و کلام کی شان اس وحی سے مختلف تھی جس سے دوسرے انبیا مشرف ہوئے

ہیں۔ اگرچہ قرآن اور تورات دونوں سے ثابت ہے کہ یہ خطاب و کلام بھی خدا سے رو در رو نہیں بلکہ من وراء حجاب، یعنی پردے کی اوٹ ہی سے تھا۔

انبیاء کے ناموں میں ترتیب کی حکمت

یہاں حضرات انبیا کے جو نام گنائے گئے ہیں ان کی ترتیب حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کے ذکر تک تو تاریخی ہے لیکن اس کے بعد ترتیب صفاتی ہو گئی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت یونسؑ، حضرت ہارونؑ اپنے خاص نوع کے ابتلا اور خاص نوع کی تائید الٰہی میں فی الجملہ اشتراک رکھتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ دونوں نبی بھی ہیں اور دونوں بادشاہ بھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد لانے کی وجہ خاص اہتمام کے ساتھ زبور کی طرف توجہ دلانا ہے۔ سب سے آخر میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰؑ مماثل نبی ہیں۔ اس بات کا ذکر قرآن اور احادیث دونوں میں ہے۔

انبیاء کے ذکر سے مقصود

یہاں اگرچہ تمام انبیا کا ذکر نہیں ہوا ہے لیکن ان کے اندر اشتراک کے ساتھ ساتھ باعتبار صفات جو تنوع ہے وہ بھی نمایاں ہو گیا ہے اور باعتبار وحی و خطاب اور کلام ان میں سے اگر کسی کو کوئی اختصاص و امتیاز حاصل ہوا ہے تو وہ بھی سامنے آگیا ہے۔ اس تمام حوالے سے قرآن کا مقصود یہ ہے کہ یہ انبیاء ہیں جن کے نام اور کام تورات کے صحیفوں میں بھی بیان ہوئے ہیں اور یہ طریقہ رہا ہے جس طریقہ پر اللہ نے ان نبیوں کو اپنی وحی اور اپنے خطاب و کلام سے نوازا ہے[1]، ان سب سے اہل کتاب واقف ہیں، بھلا ہے اس میں کہیں ذکر اس بات کا کہ اللہ نے کسی نبی پر اس طرح کتاب اتاری ہو کہ اس کو اترتے سب نے دیکھا ہو، موسیٰؑ سے بے شک اللہ تعالیٰ نے کلام کیا، جس طرح کلام کیا جاتا ہے، لیکن ان یہود کا اطمینان اس سے بھی نہ ہوا۔ انھوں نے اس پر بھی یہ شبہ وارد کر دیا کہ جب تک خدا ہم سے رُو در رُو ہو کر کلام نہ کرے ہم کس طرح باور کریں کہ وہ تم سے کلام کرتا ہے۔ شک کے ایسے مریضوں کا کیا علاج؟

ان آیات میں استدلال کا پہلو

ان آیات میں استدلال کا پہلو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ہے کہ اگر وحی کوئی ایسی چیز ہوتی جس کا تجربہ تنہا تمھی نے پیش کیا ہوتا اور نبوت و رسالت کوئی ایسی چیز ہوتی جس کا دعویٰ دنیا میں اکیلے تمھی نے کیا ہوتا تب تو ایک حد تک گنجائش تھی کہ ان لوگوں کو معذور خیال کیا جاتا جو تمھارے دعوے پر اضطراب کا اظہار کریں اور اس انوکھے دعوے کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں جب تک ہر پہلو سے اپنا اطمینان نہ کر لیں لیکن جب انبیاء کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے اور ان پر جن شکلوں میں اور جن باتوں کی وحی آئی ان کے بھی دفاتر موجود ہیں تو ان لوگوں کی طرف سے تمھاری صداقت کے ثبوت کے لیے ایسے بے سروپا مطالبات کے کیا معنی جو ان تمام رسولوں اور نبیوں کے نام لیوا بھی ہیں اور ان تمام کتابوں کے حامل ہونے کے مدعی بھی

---

[1] وحی کی حقیقت اور اس کے اقسام پر ان شاء اللہ ہم سورۂ شوریٰ میں بحث کریں گے۔

جہان انبیا پر نازل ہوئیں جس طرح ہر گروہ کی کچھ مشترک خصوصیات و صفات ہوتی ہیں اسی طرح انبیا کے گروہ کی بھی مشترک خصوصیات و صفات ہیں اور یہ ایسی نمایاں ہیں کہ ان کے حامل تمام دنیا سے الگ نظر آتے ہیں۔ نہ تو یہ ممکن ہے کہ کوئی جھوٹا مدعی ان کے اندر داخل ہو سکے اور نہ اس کا امکان ہے کہ جو ان کے اندر شامل ہو اس کو ان کے زمرے سے الگ کیا جا سکے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۱۶۵)

"رُسُلًا" فعل محذوف سے منصوب بھی ہو سکتا ہے اور بدل بھی ہو سکتا ہے۔ دونوں ہی شکلوں میں معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔

انبیا کا مشترک مشن

اس آیت میں رسولوں کا مشترک مشن بھی بتا دیا اور وہ ضرورت بھی جو ان کے بھیجنے کی داعی ہوئی۔ ان کا مشترک مشن لوگوں کو بشارت دینا اور خطرے سے آگاہ کرنا ہے۔ بشارت اس بات کی کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کریں گے ان کے لیے ابدی زندگی کی خوشیاں اور کامرانیاں ہیں۔ آگاہی اس بات کی کہ جو لوگ کفر اور بدعملی کی راہ اختیار کریں گے ان کے لیے دائمی عذاب نار ہے۔

انبیا کی بعثت کی ضرورت

اس کی ضرورت یہ بتائی کہ لوگوں پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ یہ کہنے کا موقع کسی کے لیے باقی نہ رہے کہ ان کے پاس اس خطرے سے آگاہ کرنے والا کوئی نہیں آیا ورنہ وہ ہرگز کفر و بدعملی کی راہ نہ اختیار کرتے۔ اگرچہ خدا عزیز ہے، وہ انبیا کے بھیجے بغیر بھی لوگوں کو ان کی نافرمانیوں پر سزا دیتا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا لیکن وہ حکیم بھی ہے، اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ کسی کو سزا دے تو اتمام حجت کے بعد ہی دے۔ یہ حجت رسولوں کے آنے کے بعد پوری ہو گئی۔ عقل و فطرت کی جو شہادت ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور نیکی اور عدل سے محبت، ظلم و گناہ سے نفرت کی انسان کے اندر ودیعت تھی وہ ان انبیا نے پوری طرح آشکارا کر دی۔ ان کے جو تقاضے ہو سکتے تھے وہ بھی پوری تفصیل سے بیان کر دیے۔ اب اگر کوئی ٹھوکر کھاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دونوں آنکھیں رکھتے ہوئے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھاتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسانی فطرت خیر و شر کے شعور سے محروم نہیں ہے اور نہ عقل حق و باطل میں امتیاز سے قاصر ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم پر پیدا کیا ہے اور اس کو خیر و شر کی معرفت بخشی ہے لیکن اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ عقل و فطرت کی رہنمائی کے ساتھ وحی اور انبیا کی رہنمائی سے بھی اس کو نوازے تاکہ عقل و فطرت کے تقاضے اس کے سامنے بالکل مُبرہن ہو کر آ جائیں اور گمراہی کے لیے ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہ جائے۔

لَّٰكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُ بِعِلْمِهِ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿١٦٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١٦٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى

اللّٰہِ یَسِیۡرًا (۱۶۶-۱۶۹)

استدراک کا پہلو

حرف 'لٰکِنْ' استدراک کے لیے آتا ہے۔ یہ استدراک اس بات پر ہے جو اوپر والے ٹکڑے سے نکلتی ہے۔ اوپر انبیا کے سلسلے اور ان کی طرف وحی بھیجے جانے کا تفصیل کے ساتھ جو حوالہ دیا ہے اس سے مقصود، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اہل کتاب کے مکذبین پر یہ واضح کرنا تھا کہ جو حقیقت ایسی جانی پہچانی ہوئی ہے، جس کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے اتنے معیارات اور اتنی کسوٹیاں موجود ہیں، اگر یہ اس کو جھٹلاتے ہیں تو بس ان کی شامت ہی آئی ہوئی ہے۔

اس کے بعد اس پر استدراک کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ جھٹلاتے ہیں تو جھٹلائیں اللہ تو اس چیز کی گواہی دیتا ہے جو اس نے تمھاری طرف اتاری ہے۔ یعنی اس بات کی گواہی کہ یہ من جانب اللہ ہے، اس میں نفس اور شیطان کو کوئی دخل نہیں ہے، اللہ نے اس کو اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے، اس میں کسی وسوسۂ نفسانی یا کسی دندغۂ شیطانی کی کوئی آمیزش نہیں ہے، اس کا تعلق علمِ الٰہی کے پاک سرچشمہ سے ہے اور یہ آبِ حیات کی طرح بالکل خالص اور بے آمیز ہے۔ مزید فرمایا کہ اس کے حق میں گواہی تو اللہ ہی کی کافی ہے لیکن اللہ کے ساتھ فرشتے بھی اس کے گواہ ہیں۔

یہ کلام پیغمبرؐ کی تسلی کے لیے ہے

یہ ارشاد، جیسا کہ واضح ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے ہے کہ یہ مخالفین تمھاری وحی کو وحی نہیں مانتے تو نہ مانیں، اس کی صحت و صداقت ان کے ماننے نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے۔ تمھارے اطمینان کے لیے یہ بس ہے کہ خدا اور فرشتے اس کے گواہ ہیں۔ تم جس بزمِ قدس سے وابستہ ہو تمھارے لیے سند ان کی سند ہے نہ کہ ان محروم القسمت لوگوں کی جو کفر اور پیغمبر میں امتیاز سے قاصر ہیں۔ یہ لوگ تو حق سے دور ہوتے ہوتے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ اب ان کے لیے راہ حق کی طرف مڑنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا ہے۔ انھوں نے اپنے کفر اور اپنی جانوں پر خود اپنے ہاتھوں ظلم سے اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا ہے کہ خدا ان کی مغفرت فرمائے یا جہنم کے راستے کے سوا کوئی اور راہ ان کو دکھائے۔ اب یہ جہنم ہی میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اور خدا کے لیے یہ معاملہ بہت آسان ہے۔ اس نے ان پر حجت تمام کر دی، اب یہ چیز ذرا بھی اس پر شاق نہیں گزرے گی کہ یہ جہنم میں پڑیں اور اس میں ہمیشہ رہیں۔ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا کے ٹکڑے پر ہم دوسری جگہ بھی بحث کر چکے ہیں۔

نبی کی صداقت کی ایک باطنی دلیل

یہ کلام اگرچہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، تسلی کے محل میں ہے لیکن یہ وحی کی صداقت کی ایک دلیل بھی ہے جس کا تعلق پیغمبرؐ کی ذات سے ہے۔ اوپر وحی کی صداقت کی جو دلیل بیان ہوئی ہے اس کی نوعیت تاریخی شہادت کی ہے۔ یعنی انبیا کی تاریخ اور ان کی وحی کی کسوٹی پر جانچ کر قرآن اور پیغمبر کا درجہ متعین کیا گیا ہے۔ اب یہ ایک دوسری دلیل بیان ہوئی ہے جس کی نوعیت ایک باطنی دلیل کی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ پیغمبر اپنے باطن میں خدا اور فرشتوں کی شہادت اس طرح سنتا سمجھتا اور پرکھتا ہے کہ اس کے

لیے اپنی وحی کی صداقت پر کسی شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح کی شہادت کسی غیر نبی کو حاصل نہیں ہوتی اس وجہ سے کسی غیر نبی کے الہام اور نبی کی وحی میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی جس کیفیت کو الہام سمجھ رہا ہے وہ محض ایک وسوسۂ نفسانی یا شیطانی ہو لیکن پیغمبر پر وحی جس افق سے آتی ہے، جس زور و قوت کے ساتھ آتی ہے اور اللہ اور ملائکہ کی جس تائید و شہادت کے ساتھ آتی ہے وہ بجائے خود ایک ایسی برہان ہوتی ہے جس کے بعد کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ وحی کی صداقت کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے ساری خدائی بھی نبی کی تکذیب کرے تب بھی اس کے اعتماد میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی بزم و انجمن اس کے باطن کے اندر ہوتی ہے جہاں اس کو خدا اور روح القدس کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اس مسئلے پر مزید بحث انشاء اللہ ہم سورۂ تحریم میں کریں گے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (۱۷۰)

ایک عام تعبیر میں روئے سخن عیسائیوں کی طرف ہے

خطاب اگرچہ عام ہے لیکن آگے والی آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ روئے سخن اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کی طرف ہے۔ فرمایا کہ اے لوگو، اللہ کا رسول تمہارے پاس حق لے کر آگیا ہے۔ اللہ کے دین میں تم نے جو ملاوٹیں کر دی تھیں اور جن کے سبب سے یہ معلوم کرنا ناممکن ہو گیا تھا کہ حق کیا ہے، اب ان تمام ملاوٹوں سے پاک ہو کر دین از سرِ نو اپنی کامل شکل میں تمہارے پاس آگیا ہے۔ اس پر ایمان لاؤ، اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔ اگر تم اس کا انکار کرو گے تو یاد رکھو کہ خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تمہارا ہی بگڑے گا۔ خدا تو سب سے بے نیاز ہے۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ سب اس کے قابو میں ہیں اور وہ ہر ایک کے اعمال سے واقف ہے، وہ ہر نفس کو اس کے اعمال کی جزا دے گا۔ اگر یہ چیز آج ٹل رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جزا ہے ہی نہیں۔ بلکہ یہ اس کی حکمت کے تحت ٹل رہی ہے، خدا حکیم بھی ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۖ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۘ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (۱۷۱)

'غلو' کا مفہوم

لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ، 'غَلَا يَغْلُو' کے معنی بڑھنے، زیادہ ہونے، متجاوز ہونے کے ہیں۔ جب یہ لفظ دین کے تعلق سے آئے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ دین میں جس چیز کا جو درجہ و مرتبہ یا جو وزن و مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ جو چیز پاؤ سیر ہے وہ من بھر کر دی جائے، جو حکم صرف استحباب و استحسان کا درجہ رکھتا ہے اس کو فرض اور واجب کا درجہ دے دیا جائے، جو شخص ایک فقیہ یا مجتہد یا

معانی ہے اس کو امام معصوم بنا دیا جائے، جس کو اللہ نے نبی اور رسول بنایا اس کو شریکِ خدا یا خدا بنا ڈالا جائے، جس کی صرف تعظیم مطلوب ہے اس کی عبادت شروع کر دی جائے، یہ اور اس قبیل کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں اور جس طرح مذہب کے معاملات میں تفریط بہت بڑا جرم ہے، اسی طرح یہ افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے مذہب کا وہ مزاج، جو سر تا سر اعتدال ہے، بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے اور اس کی وہ خدائی ترکیب و تالیف جو اس کے اجزا کو حسن و جمال کا ایک دلآویز پیکر بناتی ہے بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ یوں تو اس غلو میں تمام اہلِ مذاہب مبتلا ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ہم مسلمان بھی، جن کو عدل و قسط پر قائم رہنے کی سب سے زیادہ تاکید ہوئی ہے، اس فتنے میں مبتلا ہو گئے لیکن نصاریٰ کو تو یوں سمجھیے کہ اس فساد میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی اصلی بیماری یہی ہے کہ انھوں نے اپنے اس غلو کے سبب سے پورے دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام خدا کے بندے اور اس کے رسول تھے، ان کو انھوں نے خدا کا بیٹا بنایا اور پھر ان کو لے جا کر خدائی کے عرش پر بٹھا دیا، حضرت مریم، حضرت عیسٰیؑ کی والدہ تھیں، ان کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنایا، حضرت جبریلؑ خدا کے بندے اور فرشتے ہیں ان کو بھی ایک اقنوم کی حیثیت دے کر خدائی کی تثلیث میں شریک کر دیا، سیدنا مسیحؑ نے دنیا اور دنیوی زندگی کے زخارف سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی تو انھوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ غرض اس غلو کے ہاتھوں انھوں نے مذہب کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں چھوڑی جو اپنی جگہ پر برقرار رہ گئی ہو۔ فرش کی چیز عرش پر پہنچ گئی اور عرش کی چیز فرش پر آ رہی۔

غلو کے فتنہ کا راستہ

وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ۔ دین میں غلو کا فتنہ جس راہ سے پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کی تائید و تقویت کا سارا سامان جہاں سے فراہم ہوتا ہے، یہ اس کا سدِباب ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی طرف وہی بات منسوب کی جائے جو اس نے فرمائی ہے تو اس سے کسی فتنے کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ فتنے کا دروازہ اس وقت کھلتا ہے جب اس کی طرف وہ بات منسوب کی جائے جو اس نے نہیں فرمائی ہے۔ یہی چیز بدعت ہے اور یہیں سے شیطان کو دین میں گھسنے اور اس میں فساد برپا کرنے کی راہ کھلتی ہے۔ نصاریٰ جہاں سے ہلاک ہوئے ہیں وہ یہی دروازہ ہے۔ انھوں نے پال کی تمام خرافات کو اپنے دین کا جزو بنا دیا اور پھر اس پر اپنے سارے علمِ کلام کی عمارت کھڑی کر لی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انجیلوں میں تحریفات کے باوجود، اس فتنے کی آرائش کے لیے کچھ زیادہ مواد موجود نہیں ہے جس میں مسیحی مبتلا ہوئے بعض چیزیں تحریف کی راہ سے ان میں داخل بھی کی گئیں تو ان کی تردید کا سامان بھی، جیسا کہ ہم نے آل عمران میں واضح کیا ہے، انہی میں موجود ہے۔ اصل گمراہی کا مواد پال کی تعلیمات میں ہے اور ان کا تعلق نہ خدا سے ہے نہ مسیح سے۔

مسیح کی اصل حقیقت

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ الاٰیۃ۔ اب یہ مسیح کے بارے میں وہ صحیح بات بتائی گئی ہے جو اللہ

نے ان کے باب میں فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، ان کی ولادت، اللہ کے کلمۂ کُن سے ہوئی جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم کی طرف القا فرمایا، اور ان کو روح بھی خدا ہی کی جانب سے عطا ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی خارق عادت ولادت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر ان کو خدائی کا درجہ دے دیا جائے۔ ان کی ولادت اسی طرح خدا کے کلمۂ کن سے ہوئی ہے جس طرح آدم کی ولادت کلمۂ کن سے ہوئی ہے اور ان کے اندر بھی خدا نے اسی طرح روح پھونکی ہے جس طرح آدم کے اندر روح پھونکی۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں، وجود اور زندگی تو جس کو بھی ملتی ہے خدا ہی کے حکم اور اسی کی عطا کردہ روح سے ملتی ہے۔ آل عمران آیت ۵۹ کے تحت بھی یہ بحث گزر چکی ہے۔

'فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ' یعنی اپنے چند توہمات کو بنیاد بنا کر یہ تثلیث کا گورکھ دھندا جو تم نے کھڑا کیا ہے اس سے تائب ہو کر اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ 'رسولوں پر ایمان لاؤ' کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جب خدا کے تمام رسولوں کی تعلیم تورات و انجیل میں موجود ہے اور اس تعلیم میں مسیح سے لے کر آدم تک کہیں تثلیث کا سراغ نہیں ملتا تو آخر یہ فتنہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا۔ پس صحیح راستہ تو یہ ہے کہ یہ الگ پگڈنڈی نکالنے کے بجائے تم بھی اس صراط مستقیم پر چلو جس پر تمام نبی اور رسول چلے۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ مسیح کی تعلیم اللہ اور اس کے رسولوں کی متفقہ تعلیم سے بالکل الگ ہو۔

تثلیث کا عقیدہ

'ثَلٰثَةٌ' سے مراد نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث ہے جو پال کی اختراعات میں سے ہے۔ اس عقیدے کی رو سے الوہیت میں باپ، بیٹے اور روح القدس تینوں شریک ہیں۔ یہ عقیدہ یوں تو بالکل مشرکین کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ انجیلوں میں توحید کی تعلیم جو نہایت واضح الفاظ میں دی گئی ہے، کچھ اس کی بھی لاج رکھی جائے[۱]۔

'اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ' میں 'خَيْرًا' اسی طرح فعل محذوف سے منصوب ہے جس طرح اوپر والی آیت میں

---

[۱] ہمارے مخدوم مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر میں مسیحیوں کا یہ عقیدہ خود ان کے الفاظ میں اس طرح نقل کیا ہے۔

"باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر، عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح القدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود اور روح القدس غیر محدود۔ باپ ازلی، بیٹا ازلی، اور روح القدس ازلی۔ تاہم تینوں ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی۔ اس طرح تین غیر محدود نہیں اور نہ تین غیر مخلوق بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود۔ یوں ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق، اور روح القدس قادر مطلق۔ تو بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق۔ ویسا باپ خدا، بیٹا خدا اور روح القدس خدا۔ بس بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا۔" اس کی ایک تعبیر خود نصاریٰ ہی کے الفاظ میں، ہم نے اپنی کتاب حقیقت شرک میں بھی نقل کی ہے وہ ابتدائی تعبیر ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

ہے۔ یہ بات یہاں دھمکی کے اسلوب میں ہے۔ یعنی یہ تین میں ایک اور ایک میں تین کے چکر سے باہر نکلو ورنہ شامت آجائے گی۔ اللہ ہی واحد الٰہ ہے۔ اس کی الوہیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کی صفاتِ الوہیت کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ اس کے اولاد مانی جائے۔ وہ ازلی و ابدی اور سب سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے تو اسے بیٹوں اور بیٹیوں کی کیا ضرورت ہے؟ وہ سب کی کارسازی، سب کی مدد، اور سب کے بھروسے کے لیے کافی ہے تو اس کے ساتھ کسی دوسرے کو جوڑنے کے کیا معنی؟ یعنی یا تو خدا اپنی ذات میں کوئی خلا رکھتا ہو تب شرک کی گنجائش پیدا ہوتی ہے یا دوسروں کی ضروریات کے اعتبار سے کوئی کمی اس کے اندر ہو تب اس کی گنجائش پیدا ہوتی ہے، اگر وہ اپنی ذات اور صفات میں بھی کامل ہے اور اپنی خلق کے لیے بھی کافی و وافی ہے تو شرک کی گنجائش کدھر سے نکلی؟

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ڏ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۱۷۲-۱۷۳)

غلو کا بڑا سبب استکبار ہے

'استنکاف' کے معنی ہیں کسی چیز سے غیرت، حمیت، خودداری یا استکبار کے سبب سے اعراض کرنا۔ اس آیت کا صحیح زور سمجھنے کے لیے لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ والی آیت نگاہ میں رکھیے۔ غلو کے فتنے میں مبتلا ہونے کا بڑا سبب درحقیقت استکبار ہے۔ جو لوگ کسی چیز یا کسی شخص کو مان لیتے ہیں، وہ اگر حدود سے واقف یا ان کو ملحوظ رکھنے والے نہ ہوں تو ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس چیز یا شخص کو سب چیزوں اور تمام اشخاص سے بڑھ کر ثابت کر دکھائیں۔ پھر وہ اپنے استکبار کے اعتبار سے اس کو بڑھانا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کو بڑھاتے بڑھاتے اس حد تک پہنچا دیتے ہیں جہاں پہنچ کر ان کے استکبار کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اب برتری کے میدان میں کوئی ان کا حریف نہیں رہا اور یہاں کوئی ان کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ عیسائیوں کو یہی فتنہ پیش آیا۔ انھوں نے جب حضرت عیسیٰ کو مانا تو صرف اتنے ہی پر قانع نہ رہ سکے کہ ان کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ اللہ کے بندے اور رسول تو بہت سے ہیں اگر مسیح بھی اللہ کے بندے اور رسول ہی ہیں تو پھر ان کا اور ان کے ماننے والوں کا امتیاز کیا ہوا؟ اس محرک نے، جو کھلا ہوا استکبار ہے، انھیں آمادہ کیا کہ وہ کھینچ تان کر ان کو شریک خدا ثابت کریں۔

قرآن نے عیسائیوں کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے کہ خدا کی بندگی کو تو مسیح نے نہ عار سمجھا نہ سمجھیں گے، نہ روح القدس اور دوسرے مقرب فرشتے اس کو عار سمجھیں گے۔ وہ اپنے درجے اور مرتبے کو خوب جانتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے خدا کی بندگی کو عار سمجھا اور اپنے استکبار کے نشے میں یہ سارا فساد

برپا کیا ہے ایسے سارے لوگوں کو خدا اپنے حضور میں جمع کرے گا۔ اس دن ان لوگوں کو جنھوں نے ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کی ہوگی اللہ پورا پورا اجر بھی دے گا اور ان کو اپنے نفس سے بھی نوازے گا۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے خدا کی بندگی کو عار سمجھا اور غرور میں آکر بات کا بتنگڑ بنایا تو اللہ ان کو دردناک عذاب دے گا اور ان کا کوئی کارساز و مددگار نہ ہوگا جو ان کی طرف سے اللہ کے مقابل میں کھڑا ہو سکے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (۱۷۴-۱۷۵)

'برہان' اور 'نور مبین' سے مراد

'برہان' اور 'نور مبین' سے مراد قرآن مجید ہے۔ 'برہان' کے لفظ سے اس کے عقلی و استدلالی پہلو کو واضح فرمایا ہے کہ وہ ایک حجت قاطع ہے، اس کے اندر ہر شبہ، ہر اعتراض اور ہر سوال کا مسکت اور تشفی بخش جواب موجود ہے بشرطیکہ آدمی اس پر کھلے دل سے غور کرے۔

'نور مبین' سے اس کے عملی پہلو کو واضح فرمایا ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں حق و باطل کو واضح کر کے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتا ہے اور تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔

'ہدایت' سے مراد مطلوب و مقصود کی ہدایت

'وَيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا' میں ہدایت کا لفظ میرے نزدیک اس ہدایت کے لیے ہے جو اہل ایمان کو آخرت میں حاصل ہوگی۔ قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ بقرہ میں ہدایت کے مختلف مدارج پر بحث گزر چکی ہے۔ آخرت کی ہدایت مقصود و مطلوب کی طرف ہدایت ہے۔ یہ بات کہ اس ہدایت کا تعلق آخرت سے ہے اس سے نکلتی ہے کہ اس کا عطف 'فَسَيُدْخِلُهُمْ' پر ہے جس کا تعلق صریحاً آخرت سے ہے اور یہ بات کہ یہ ہدایت مطلوب و مقصود کی طرف ہے 'اِلَيْهِ' کے لفظ سے نکلتی ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ پر ایمان اور اس حبل اللہ کو جو قرآن کی شکل میں ان کی طرف نازل ہوئی ہے مضبوطی سے پکڑ لیں گے خدا ان کو اپنی رحمت اور فضل بے پایاں سے بھی نوازے گا اور براہ مستقیم اور براہِ راست ان کی رہنمائی اپنے قرب کی طرف بھی فرمائے گا اور یہ آخرت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہوگی اس لیے کہ تمام ہدایت و شریعت کی اصل غایت اور اہل ایمان کی تمام مساعی کا اصل مقصود و مطلوب یہی قربِ الٰہی ہے۔ اس آیت کا خطاب عام ہے جس میں مسلمان، اہل کتاب اور اہل عرب سب آگئے ہیں۔

۴۴۔ آگے کا مضمون ——— آیت ۱۷۶

آخری آیت بطور ضمیمہ

اوپر والی آیت پر یہ سورہ تمام ہوئی۔ اب آگے ایک آیت بطور ضمیمہ لگا دی گئی ہے جو ابتدائے سورہ کے بیان کردہ احکامِ وراثت کے ایک خاص مسئلے کی وضاحت کے لیے بعد میں نازل ہوئی۔ اس کے

آخر میں کذٰلک یبین اللہ کے الفاظ سے اشارہ بھی فرما دیا ہے کہ یہ توضیحی آیت ہے جو بعد میں توضیح کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ اس قسم کے ضمیمے کی مثال سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ آیت کی تلاوت فرمائیے۔

آیت ۱۷۶

یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾

ع ۲۴ ۴

ترجمۂ آیت ۱۷۶

وہ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مرے، اس کے کوئی اولاد نہ ہو، اس کے ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے ترکہ کا نصف ہے اور وہ مرد اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس بہن کے کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر بہنیں دو ہوں تو ان کے لیے اس کے ترکہ کا دو تہائی ہوگا اور اگر کئی بھائی بہن مرد عورتیں ہوں تو ایک مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔ اللہ تمھارے لیے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ مبادا تم گمراہی میں پڑ جاؤ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱۷۶

۴۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

کلالہ کی میراث کا حکم

کلالہ کی میراث کا حکم آیت ۱۲ میں گزر چکا ہے۔ کلالہ سے مراد وہ مورث ہے جس کے نہ اصول میں کوئی ہو، نہ فروع میں، صرف بھائی بہن وغیرہ ہوں۔ اگر آیت ۱۲ کے حکم کو صرف اخیافی بہن

کے ساتھ مخصوص مان لیا جائے تو اس توضیحی حکم کے بعد کلالہ کی وراثت کے حکم کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیلات فقہ و فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں

سورۂ نساء کی تفسیر کی یہ آخری سطریں ہیں جو اس گنہگار کے قلم سے حوالۂ قرطاس ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔